الرسالہ

Al-Risala

January 1994 • Issue 218 • Rs. 7

اس دنیا میں مل کر کام کرنے کا راز صرف ایک ہے
رایوں میں اختلاف کے باوجود
عمل میں اختلاف نہ کیا جائے۔

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N.Y. 11230
TEL: (718) 258-3435



The Guri-i Amir, Samarqand

WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

By Maulana Wahiduddin Khan

The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

Price Rs. 85
ISBN 81-85063-75-3

AL-RISALA BOOKS
The Islamic Centre
(Publications Division)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110 002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N.Y. 11230
TEL: (718) 258-3435

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جنوری ۱۹۹۵، شمارہ ۲۱۸

فہرست	صفحہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7 □ Annual Subscrption Rs. 70/$ 25 (Air mail)
Printing by Nice Printing Press, Delhi

ذکر و فکر

قال الشیخ ابو سلیمان الدارانی: انی لاخرج من منزلی فمایقع بصری علی شیء الا رأیت للّٰہ علی فیہ نعمۃ ولی فیہ عبرۃ۔

شیخ ابوسلیمان دارانی نے کہا کہ میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو میرا حال یہ ہوتا ہے کہ جس چیز پر بھی میری نظر پڑتی ہے اس میں مجھے اللہ کی نعمت دکھائی دیتی ہے اور اس میں میرے لیے عبرت ہوتی ہے۔

عن الحسن البصری انہ قال: تفکر ساعۃ خیر من قیام لیلۃ۔

حسن بصری نے کہا کہ ایک گھڑی کے لیے اللہ میں سوچنا ساری رات نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

قال سفیان بن عُیینہ: الفکرۃ نور یدخل قلبک ویقول:
اذا المرء کانت لہ فکرۃ، ففی کل شیٔ لہ عبرۃ۔

سفیان بن عیینہ نے کہا کہ غور و فکر کرنا روشنی ہے جو تمہارے دل میں داخل ہوتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جب آدمی کے اندر سوچ کا مادہ ہو تو ہر چیز میں اس کے لیے عبرت و نصیحت ہوگی۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ آدمی مبارک ہے جس کا بولنا یاد الٰہی کا بولنا ہو۔ جس کی خاموشی غور و فکر کی خاموشی ہو اور جس کا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو (عن عیسیٰ علیہ السلام انہ قال: طوبیٰ لمن کان قیلہُ تذکراً وصمتہ تفکراً ونظرہ عبراً)

دین کی اصل حقیقت ذکر و فکر ہے۔ ذکر و فکر سے مراد معروف قسم کے اوراد و اشغال نہیں ہیں۔ ذکر و فکر ایک زندہ عمل ہے جو شعور خداوندی کی زمین پر پیدا ہوتا ہے۔ جب ایک شخص پر اللہ کی حقیقت اپنے جلال و کمال کے ساتھ منکشف ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں ایک نئی روشنی آجاتی ہے۔ اس کی روح ربانی جلووں سے بیدار ہو جاتی ہے۔

ایسا آدمی اندر سے باہر تک بدل جاتا ہے۔ اس کا چپ رہنا اور اس کا بولنا، اس کا دیکھنا اور اس کا سننا، اس کا چلنا اور اس کا رکنا، ہر چیز میں ایک ربانی نور پیدا ہو جاتا ہے۔ ساری دنیا اس کے لیے رزق رب کا دسترخوان بن جاتی ہے۔

یہی وہ ربانی انسان ہے جس کو مومن باللہ کہا جاتا ہے۔

عبادت اور اقتدار

وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امناً یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً ومن کفر بعد ذٰلک فاولٰئک ہم الفاسقون (النور ۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور ان کے لیے ان کے دین کو جمادے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کی خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد انکار کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔

یہاں خلافت سے مراد سیاسی اقتدار ہے۔ دنیا میں سیاسی اقتدار اللہ کی طرف سے دیا جاتا ہے، اور وہ مختلف مصالح کے تحت اہل ایمان اور غیر اہل ایمان دونوں کو ملتا ہے۔ اہل ایمان کو اقتدار عطا کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح کا ثبوت فراہم کر دیں۔ اقتدار اہل ایمان کے لیے ایک قومی انعام ہے جو قومی استعداد کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔

استخلاف کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ پھر وہ صرف اللہ کی عبادت کریں گے، اور کسی چیز کو اللہ کی عبادت میں شریک نہیں بنائیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیاسی اقتدار کے بعد انھیں مکمل عبادت کا موقع ملے گا۔ اب تک ان کی عبادت جزئی طور پر نماز روزہ تک محدود تھی اور اب وہ سیاسی اور قانونی معاملہ میں بھی عبادت گزار بن جائیں گے۔ اس سے مراد دراصل حالتِ خوف کا خاتمہ ہے نہ کہ ناقص عبادت گزاری کا خاتمہ۔

عبادت کا عمل زمین پر نہیں ہوتا بلکہ فرد کی اپنی شخصیت پر ہوتا ہے۔ شخصیتِ انسانی ہی عبادت کا محل ہے۔ ناقص عبادت یہ ہے کہ آدمی کی عبادت میں خشوع اور تقویٰ کی روح نہ پائی جائے۔ اور کامل عبادت یہ ہے کہ آدمی تقویٰ اور خشوع کے ساتھ عبادت کا عمل کرے۔ اس کی عبادت میں ظاہری آداب کے ساتھ عبادت کی داخلی اسپرٹ بھی پوری طرح موجود ہو۔

تین منٹ

سید امتیاز الدین دسنوی ایک انجنیئر ہیں۔ ۱۹۶۷ میں وہ سروس کے تحت ضلع پونہ کی ایک بستی لونولہ (Lonavla) میں تھے۔ ایک روز جب کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے، سڑک پر شور وغل کی آواز آئی۔ ہندوؤں کا ایک جلوس مسجد سے ملی ہوئی سڑک سے گزر رہا تھا۔ مسجد کے سامنے پہنچ کر وہ لوگ ٹھہر گئے اور زور زور سے باجا بجانے لگے۔

تراویح میں ہر دو رکعت پر سلام پھیرا جاتا ہے۔ چنانچہ امام صاحب نے جب دو رکعت پوری کرکے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو اچانک نمازی غصہ ہو گئے۔ کچھ لوگ اٹھنے لگے کہ جاکر جلوس والوں سے کہیں کہ یہ مسجد ہے، یہاں شور نہ کرو، آگے جاؤ۔ سید امتیاز الدین صاحب نے کہا کہ چند منٹ بیٹھ کر آپ ذکر کر لیجئے، یہ لوگ اپنے آپ یہاں سے چلے جائیں گے۔ چنانچہ تمام نمازی خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

۲۰ مارچ ۱۹۹۴ کی ملاقات میں سید تمیز الدین صاحب نے بتایا کہ مشکل سے تین منٹ گزرے ہوں گے کہ آواز کم ہونے لگی اور تھوڑی دیر میں بالکل ختم ہو گئی۔ جلوس صرف تین منٹ مسجد کے سامنے ٹھہرا۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ ہی آگے چلا گیا۔

اس کے برعکس اگر کچھ مسلمان سڑک پر آکر روک ٹوک کرتے تو وہ لوگ ضد میں پڑ جاتے۔ اب دونوں طرف سے اصرار بڑھتا۔ یہاں تک کہ جلوس کا مسئلہ دونوں کے لئے وقار کا مسئلہ بن جاتا۔ اس کے بعد معاملہ اور آگے بڑھتا اور آخر کار وہ چیز ظہور میں آجاتی جس کو فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔ ایک طرف مسجد کی تراویح ادھوری رہ جاتی۔ دوسری طرف بستی آگ اور خون کے طوفان میں نہا اٹھتی۔

اسی قسم کا برعکس واقعہ ۱۹۸۰ میں مرادآباد میں پیش آچکا ہے۔ رمضان کے مہینہ میں غیر مسلموں کا جلوس مسجد کے سامنے آگیا اور باجا بجانے لگا۔ مسجد میں جو مسلمان نماز کے لئے جمع تھے وہ "تین منٹ" کے صبر پر راضی نہیں ہوئے۔ باہر نکل کر انھوں نے جلوس کو روکنا شروع کیا۔ اس کا انجام مرادآباد کو بھیانک فساد کی صورت میں برداشت کرنا پڑا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امن اور فساد کے درمیان صرف تین منٹ کا فاصلہ ہے۔ اگر آپ تین منٹ کے اشتعال کو برداشت کر لیں تو ہر طرف امن ہی امن ہوگا، اور اگر آپ تین منٹ کے اشتعال کو برداشت نہ کریں تو ہر طرف فساد ہی فساد۔

یہ تضاد

قدیم زمانہ میں عرب کا لفظ خشک صحرا کے ہم معنی تھا۔ مگر پٹرو ڈالر کے ظہور نے عرب کے بارہ میں پرانے تصور کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ : جاؤ عرب کماؤ کھرب۔ اس فرق نے ہر اعتبار سے عرب کے بارہ میں لوگوں کی سوچ کو بدل دیا ہے۔

عرب ملکوں میں دولت ہے مگر وہاں ہندستان جیسی جمہوریت نہیں۔ چنانچہ جو لوگ ان ملکوں میں کمانے کے لیے جاتے ہیں، وہ اختلافی امور میں بے حد محتاط رہتے ہیں۔ حتی کہ وہ اپنے کمرہ کے اندر بھی سیاسی اور اختلافی بات کرنے سے بچتے ہیں۔

۱۱ فروری ۱۹۹۰ کو میرے پاس ایک مسلم نوجوان آئے۔ وہ ڈاکٹر ہیں۔ انھوں نے ہندستان کی ایک یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کا کورس کیا ہے۔ ان کو ایک عرب ملک میں ملازمت مل گئی ہے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ میرے ماموں کو جب معلوم ہوا کہ میں ایک عرب ملک میں جا رہا ہوں تو انھوں نے مجھے بلا کر نصیحت کی۔ انھوں نے کہا کہ وہاں تم بس اپنے کام سے کام رکھنا۔ وہاں کے نظام پر کبھی کوئی تنقید نہ کرنا۔ کسی سے شکایت کی بات ہو تو اس کو نظر انداز کر دینا۔ کسی بھی معاملہ میں کسی سے نہ الجھنا۔ اگر تم میری نصیحت پر قائم رہے تو تم کامیاب رہو گے۔

مذکورہ "ماموں صاحب" کو میں جانتا ہوں۔ ایک روز وہ میرے یہاں آئے اور کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں۔ مگر وہ مجھے پسند نہیں۔ کیوں کہ آپ مسلمانوں کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ مسلمان کی شان مجاہد بننا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ مسلمانوں کے اندر جہاد کی اسپرٹ پیدا کریں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ کے ماموں صاحب عام مسلمانوں کو تو بہادری کا سبق دینا چاہتے ہیں، اور آپ کو سکھاتے ہیں کہ بزدل بن کر رہنا۔

یہی موجودہ مسلمانوں کا حال ہے۔ جہاں ان کا ذاتی مفاد خطرہ میں ہو وہاں ہر آدمی "بزدل" بنا ہوا ہے۔ اور جہاں دوسروں کا معاملہ ہو وہاں ہر آدمی بہادری کے فضائل پر الفاظ کے دریا بہا رہا ہے۔ کیسے عجیب ہیں یہ مسلمان جو اپنے فائدے کے معاملہ میں ہوشیار ہیں اور دوسروں کے معاملہ میں بیوقوف۔ کیا انھیں اپنے پیغمبر کی یہ تعلیم معلوم نہیں کہ تم اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے بھی وہی پسند کرو جو تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

قناعت

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے فلاح پائی جو اللہ کے آگے جھک گیا۔ جس کو بقدر ضرورت رزق ملا اور اللہ نے جتنا اس کو دیا اس پر اس نے قناعت اختیار کی :

عن عبدِالله بن عمرو بن العاص اَنّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال۔ قد افلح من اسلَمَ ورُزِق كفافًا وقنّعَهُ الله بما آتاه (صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فضل التعفف والصبر والقناعۃ والحث علی کل ذالک)

قناعت (contentment) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی عمل کرنا چھوڑ دے۔ قناعت کا لفظ عمل کا الٹا نہیں ہے بلکہ وہ ہوس کا الٹا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ پوری طرح ایک فعال زندگی گزارے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ زیادہ کی خواہش سے اپنے آپ کو بچائے۔ کیوں کہ زیادہ کی خواہش رکھنے والا آدمی کبھی اس دنیا میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔

قناعت کا تعلق عمل سے نہیں ہے بلکہ نتیجۂ عمل سے ہے۔ عمل تو زندگی کا تقاضا ہے۔ ایک زندہ آدمی کبھی عمل سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مگر نتیجہ کا تعلق بہت سی خارجی چیزوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اپنی حد تک وہ عمل میں کوتاہی نہ کرے اور نتیجہ کے معاملہ میں اس پر تیار رہے کہ جو بھی ملے گا وہ اس پر راضی ہو جائے گا۔

یہ دنیا کچھ اس طرح بنی ہے کہ یہاں عمل کرنا آدمی کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور نتیجہ کا نکلنا دوسرے بہت سے عوامل کے اختیار میں۔ اس لیے اس دنیا میں حقیقت پسندانہ رویہ صرف وہی ہے جس کو قناعت کہا جاتا ہے۔ تاہم اس کا مطلب نتیجہ میں قناعت ہے نہ کہ کوشش میں قناعت۔ نتیجہ کے معاملہ میں قانع بن جانا حقیقت پسندی ہے۔ جب کہ عمل کے معاملہ میں قانع بننا خودکشی کے ہم معنی ہے۔

اس معاملہ میں صحیح رویہ کا ایک سادہ معیار ہے۔ وہ یہ کہ ذہنی سکون کو بھنگ کیے بغیر کوشش کو جاری رکھا جائے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیت اور اپنے مواقع کے اعتبار سے بھرپور عمل

میں لگا رہے۔ جہاں تک نتیجہ کا تعلق ہے، وہ صرف اس حد تک اس کا طالب بنے جب تک اس کا ذہنی سکون بھنگ نہ ہو۔ جب نتیجہ کی خواہش میں اس کا ذہنی سکون چھننے لگے تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ قناعت کے دائرہ سے نکل کر ہوس کے دائرہ میں داخل ہوگیا ہے۔ اور ہوس بہر حال قابل ترک ہے۔

قانع آدمی کے لیے پیسہ برائے ضرورت ہوتا ہے اور غیر قانع آدمی کے لیے پیسہ برائے پیسہ۔ قانع آدمی اس وقت مطمئن ہو جاتا ہے جب کہ اس کو بقدر ضرورت پیسہ مل جائے۔ مگر غیر قانع آدمی کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس کی پیسہ کی طلب کسی بھی حد پر ختم نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہتی ہے۔

اس قناعت کا تعلق صرف پیسہ کے معاملہ سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر معاملہ سے ہے۔ ایک شخص سروس کر رہا ہے۔ ایک شخص لیڈری کے میدان میں ہے۔ ایک شخص حکومت کے عہدہ تک پہنچ گیا ہے۔ غرض آدمی جس شعبہ میں بھی ہو، ہر جگہ اس کے لیے ایک طریقہ ملے ہوئے پر قناعت کرنے کا ہے اور دوسرا طریقہ نہ ملے ہوئے کی طرف دوڑنے کا۔

قناعت کا طریقہ یہ ہے کہ حالات اس کو جس درجہ تک پہنچا دیں اس پر راضی ہو کر وہ اپنی ڈیوٹی انجام دینے میں لگ جائے۔ وہ ملی ہوئی حیثیت پر راضی رہے۔ اگر معمول کے مطابق اس کو مزید ترقی ملے تو اس کو وہ خوشی کے ساتھ قبول کرلے، اور اگر مزید ترقی کے مواقع نہ پیدا ہوں تو جہاں اس کو حالات نے پہنچایا ہے اس کو وہ دل کی رضامندی کے ساتھ قبول کرلے۔

پیاس آدمی کی ایک فطری ضرورت ہے۔ مگر ایک شخص وہ ہے جو صحت مند پیاسا ہو۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو پیاس کی بیماری (جوع البقر) میں مبتلا ہو جائے۔ صحت مند پیاسا صرف بقدر ضرورت پانی کا طالب ہوتا ہے۔ بقدر ضرورت پانی پینے کے بعد وہ بالکل مطمئن ہو جاتا ہے۔ مگر جو شخص پیاس کی بیماری میں مبتلا ہو جائے، وہ ہر وقت پانی کا طالب بنا رہے گا۔ پانی کی کوئی بھی مقدار اس کو مطمئن کرنے والی نہیں۔

قانع آدمی اس دنیا میں صحت مند پیاسے کی مانند ہے، اور غیر قانع آدمی اس دنیا میں بیمار پیاسے کی مانند۔

امامت عالم

امتِ محمدی سے پہلے بنی اسرائیل کو خدا کی کتاب کے حامل کی حیثیت حاصل تھی۔ قرآن میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ان میں امام بنائے جو اللہ کے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے

وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا) السجدہ ۲۴

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امامتِ عالم کا تعلق صبر سے ہے۔ جو گروہ صبر کا ثبوت دیتا ہے وہی اللہ کے نزدیک اس کا مستحق قرار پاتا ہے کہ اس کو قوموں کے اوپر امام بنایا جائے۔ بے صبر لوگوں کو کبھی امامتِ عالم کا مقام حاصل نہیں ہوتا۔ صبر بلند کرداری کا نام ہے، اور بلند کردار لوگ ہی قوموں کے امام بنائے جاتے ہیں۔

امامت کا تعلق صبر سے کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر وہ عمل ہے جو آدمی کو اخلاقی اعتبار سے دوسروں سے اونچا اٹھاتا ہے، اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ لوگ کسی ایسے شخص ہی کو امام تسلیم کرتے ہیں جو اپنے کردار میں انھیں اپنے سے اونچا دکھائی دے۔ جو شخص لوگوں کو باعتبار کردار اپنے برابر دکھائی دے، اس کو وہ کبھی اپنا امام ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔

صابر انسان ان جذبات کو دباتا ہے جو اس کو برابری کے اخلاق کی طرف لے جانے والے ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں بلند اخلاقی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اس وقت اصول کے لیے جیتا ہے جب کہ دوسرے لوگ مفاد کے لیے جی رہے ہوتے ہیں۔ وہ اس وقت انصاف کی حمایت کرتا ہے جب کہ دوسرے لوگ قوم کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس وقت برداشت کر لیتا ہے جب کہ دوسرے لوگ انتقام پر اتر آتے ہیں۔

صابر آدمی اس وقت اپنے آپ کو محرومی پر راضی کر لیتا ہے جب کہ دوسرے لوگ پانے کے لیے دوڑتے ہیں۔ وہ اس وقت حق کے لیے قربان ہو جاتا ہے جب کہ دوسرے لوگ صرف اپنی ذات کے لیے قربانی دے رہے ہوتے ہیں۔ وہ اس وقت اپنے کو پیچھے کر لیتا ہے جب کہ دوسرے لوگ آگے کی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے دوڑ لگا رہے ہوتے ہیں۔

صبر آدمی کے اندر یہی اونچے اوصاف پیدا کرتا ہے۔ اور جو شخص ان اونچے اوصاف کا مالک ہو وہی لوگوں کو اس قابل نظر آتا ہے کہ وہ ان کے اوپر امام بن کر کھڑا ہو سکے۔

بچّوں کی تربیت

ایک صاحب کو ان کے پڑوسی نے نہایت سخت بات کہہ دی۔ وہ صاحب اس کو سن کر چپ چاپ اپنے گھر میں چلے آئے۔ انھوں نے کہنے والے کو کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے لڑکے کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت بگڑا۔ اس نے کہا کہ اس شخص کی کیسے ہمت ہوئی کہ وہ میرے باپ کو اس طرح ذلیل کرے۔ میں اس کو سبق دوں گا تاکہ آئندہ وہ کبھی ایسی ہمت نہ کرے۔

باپ نے بیٹے کو ٹھنڈا کیا۔ باپ نے کہا کہ آخر اس نے ایک لفظ ہی تو کہا ہے۔ اس نے مجھے کوئی پتھر تو نہیں مارا۔ پھر اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ اس نے اگر اپنی زبان خراب کی ہے تو ہم اپنی زبان کیوں خراب کریں۔ باپ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم اس کو بھلا دو اور اپنے کام میں لگ جاؤ۔

بیٹا اس واقعہ کو "یاد" کے خانہ میں رکھنا چاہتا تھا، باپ نے اس کو "بھول" کے خانہ میں ڈال دیا۔ جو واقعہ عام حالات میں غصہ اور انتقام کا موضوع بنتا، وہ صبر اور برداشت کا موضوع بن گیا۔ کچھ دنوں بعد خود پڑوسی کو شرمندگی ہوئی۔ اس نے آکر اپنی گستاخی کی معافی مانگی اور آئندہ کے لیے پہلے سے زیادہ بہتر ہو گیا۔

باپ اگر اپنے بیٹے کے اندر انتقام کی نفسیات ابھارتا تو وہ برائی کا ایجنٹ بن جاتا۔ مگر باپ نے جب اپنے بیٹے کو بھلانے اور برداشت کرنے کے راستہ پر ڈالا تو وہ ان کے لیے نیکی اور سچائی کا رہنما ہو گیا۔ قرآن کے لفظوں میں وہ متقیوں کا امام بن گیا (الفرقان ۷۴)

اسی کا نام بچّوں کی تربیت ہے۔ بچّوں کی تربیت یہ نہیں ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے انھیں بٹھایا جائے اور تحریر یا تقریر کی صورت میں انھیں اصلاحی باتیں سنائی جائیں۔ اصل تربیت یہ ہے کہ گھر کے اندر جب عملی طور پر وہ مواقع پیدا ہوں جہاں ایک راستہ صحیح سمت میں جاتا ہو اور دوسرا راستہ غلط سمت میں۔ ایسے مواقع پر جذبات کو برداشت کر کے اور ذاتی نقصان اٹھا کر گھر والوں کو رہنمائی دی جائے۔ ان کے ذہن کو ایک رخ سے دوسرے رخ کی طرف پھیر دیا جائے۔

تربیت پیدا شدہ حالات کے درمیان رہنمائی کے ذریعہ کی جاتی ہے نہ کہ مجرد قسم کی وعظ خوانی کے ذریعہ۔

بے قیمت

انسان خدا کی دنیا میں ہے۔ مگر وہ خدا کی دنیا میں خدا کے خلاف طریقہ اختیار کرتا ہے۔ حالاں کہ اس سے بڑا اور کوئی جرم نہیں۔ اس سے بڑی اور کوئی سرکشی نہیں۔

خدا اپنے تمام بندوں سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ وہ اس کے بندے بن کر رہیں۔ مگر انسان دوسری چیزوں کو اپنا معبود بناتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو الٰہ کا درجہ دیدیتا ہے۔ حالاں کہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی خدا نے کبھی اجازت نہیں دی۔

خدا کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کمزور کی رعایت کرتا ہے۔ مگر انسان جس شخص کو کمزور دیکھتا ہے اس کو ذلیل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ خدا اپنے بندوں کی غلطیوں کو معاف کرتا ہے۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ کوئی شخص اس کے حق میں ایک زیادتی کر دے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کو آخری حد تک تباہ و برباد کر ڈالے۔ خدا اگر کسی بندے کی غلطی پر اس کو سزا دیتا ہے تو وہ اتنی ہی سزا دیتا ہے جتنی کہ اس نے غلطی کی ہے۔ مگر انسان یہ کرتا ہے کہ وہ جس سے بگڑ جاتا ہے، پھر وہ یہ نہیں دیکھتا کہ آدمی نے کتنی غلطی کی ہے۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ آدمی نے جتنی غلطی کی ہے اتنی ہی اسے سزا دے۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ جتنا اس کے بس میں ہے اتنی سزا اسے دے ڈالے۔

یہ انسان کی سرکشی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو یہ بات سب سے زیادہ ناپسند ہے کہ اس کی دنیا میں کوئی آدمی سرکشی کرے۔ آج امتحان کی مصلحت کی بنا پر آدمی کو سرکشی کا یہ موقع ملا ہوا ہے۔ مگر جب امتحان کی مدت ختم ہوگی تو سرکشی کرنے والے اس سے بھی زیادہ بے قیمت ہو جائیں گے جتنا کوئی مکھی یا مچھر۔

موجودہ دنیا میں کوئی چیز کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں۔ خواہ وہ صحت و طاقت ہو یا دولت و اقتدار ہو یا عہدہ و منصب ہو۔ ہر چیز خدا کی ہے۔ کسی شخص کے پاس جو چیز ہے وہ اس کے لیے آزمائش کا پرچہ ہے۔ وہ اس کے پاس آزمائش کے طور پر ہے نہ کہ استحقاق کے طور پر۔

اس حقیقت کو جاننا ہی سب سے بڑی دانائی ہے۔ کیوں کہ جو آدمی اس حقیقت کو جانے گا وہ صراطِ مستقیم پر رہے گا، اور جو آدمی اس حقیقت کو نہ جانے وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جائے گا۔ جو آدمی صراط مستقیم سے بھٹک جائے اس کے لیے ابدی ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

انقلابی فیصلہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے زمانہ میں جب قرآن جمع کیا گیا تو آپ نے حکم دیا کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی لکھا ہوا حصہ ہو، وہ اس کو لے آئے۔ چنانچہ ایک بڑا ڈھیر جمع ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت زید بن ثابت انصاریؓ نے دوسرے حافظوں کی مدد سے قرآن کو ایک مصحف کی شکل میں تحریر کیا۔

زید بن ثابتؓ کا یہ مصحف قریش کے لہجہ پر تھا، جب کہ جمع شدہ ٹکڑوں میں کوئی ٹکڑا قریش کے لہجہ پر تھا اور کوئی دوسرے قبائل کے لہجہ پر۔ مذکورہ قرآن جب مرتب ہوگیا تو صحابہ کی متفقہ رائے کے مطابق، تمام بچے ہوئے ٹکڑے جلا دیے گئے۔ یہی واقعہ دوبارہ خلیفہ سوم حضرت عثمان کے زمانہ میں ہوا جب کہ مصحف صدیقی کے مطابق نسخے تیار کیے گئے، اور بقیہ لوگوں کے بطور خود لکھے ہوئے تمام مصحف صحابہ کی رائے سے جلا کر ختم کر دیے گئے۔

وہ لوگ جو کبھی پتھروں کے تقدس کے قائل تھے، ان کے لیے کلام الٰہی کی تختیوں کو نذر آتش کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ ایک عظیم الشان انقلابی فیصلہ تھا جو حقائق کے اعلیٰ شعور کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔

اصل یہ ہے کہ اصحاب رسول جو مختلف عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے، فطری طور پر انھوں نے اپنے اپنے لہجہ پر قرآن کی آیتیں لکھ رکھی تھیں۔ اگر ان کے لکھے ہوئے یہ مختلف اوراق اور ٹکڑے جلائے نہ جاتے تو بعد کو ہر ٹکڑا ایک مستقل فتنہ بن جاتا۔ کیوں کہ ہر ٹکڑا اور ہر ورق کسی صحابی کی طرف منسوب ہوکر مقدس بن جاتا۔ اس کے بعد قرآن کے متن کے بارہ میں اتنا اختلاف پیدا ہوتا کہ نہ قرآن محفوظ رہتا اور نہ امت مسلمہ۔

ان ٹکڑوں کو اگر زمین میں گاڑ دیا جاتا یا دریا میں ڈال دیا جاتا تب بھی لوگ کسی نہ کسی طرح ان کو حاصل کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جلانے کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر ان کو ختم کرنے کی نہ تھی۔

اس انقلابی فیصلہ تک پہنچنے کے لیے وہ برتر فکر درکار تھی جو جذباتی احترام سے اوپر اٹھ کر حقیقت کے تقاضوں کو دیکھ لیتی ہے۔ اصحاب رسول کو ان کے ایمان نے یہی انقلابی فکر عطا کی تھی۔ اور یہی انقلابی فکر ہے جو کسی گروہ کو تاریخ ساز گروہ کے مقام پر کھڑا کرتی ہے۔

یہ حاملینِ اسلام

صلح حدیبیہ کا واقعہ ۶ھ میں پیش آیا۔ اسی سال کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کیے۔ انھیں میں سے ایک خط وہ تھا جو دحیہ کلبی کے ذریعہ شاہِ روم ہرقل (Heraclius) کے نام بھیجا گیا۔ یہ مسیحی تھا اور نہایت ذہین اور حقیقت پسند آدمی تھا۔

ہرقل اُس وقت فلسطین میں تھا۔ اس زمانہ میں عرب کے لوگ تجارت کی غرض سے اس علاقہ میں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہرقل نے تحقیق حال کے لیے کچھ عربوں کو بلوایا جن میں ابوسفیان بن حرب بھی شامل تھے۔ ہرقل نے ترجمان کے ذریعہ ان سے گفت گو کی۔ ایک روایت کے مطابق، گفتگو کا ایک حصہ یہ تھا:

قال اخبرنی یا اباسفیان۔ فقال هو ساحر کذاب ولیس بنبی۔ فقال هرقل انی لا اُرید شتمه ولکن کیف نسبه فیکم ... کیف عقله ورأیه

(سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۵۰۳)

ہرقل نے کہا کہ اے ابوسفیان مجھے محمد کے بارے میں بتاؤ۔ ابوسفیان نے کہا کہ وہ جادوگر اور جھوٹے ہیں، وہ پیغمبر نہیں۔ ہرقل نے کہا میں تم سے ان کی سب وشتم سننا نہیں چاہتا۔ بلکہ مجھے یہ بتاؤ کہ ان کا حسب ونسب کیا ہے، ان کی سمجھ کیسی ہے اور ان کی رائے کیسی ہے۔

ہرقل ایک "کافر" تھا۔ وہ کافر ہی رہا اور کافر ہی مرا۔ مگر اُس کو اِس سے دل چسپی نہیں تھی کہ کوئی شخص اُس کے حریف کے بارہ میں برے الفاظ بولے اور وہ اس کو سن کر خوش ہو۔ بلکہ اُس کی دل چسپی اس میں تھی کہ وہ جانے کہ جو شخص اس کا حریف بن کر ابھرا ہے، وہ خاندانی شرافت اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے کیسا ہے، وہ صاحب رائے ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔

اس کے مقابلہ میں موجودہ حاملین اسلام کو دیکھئے۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے حریف کے خلاف کوئی بھی لغویات سننے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کوئی کمینہ آدمی اگر ان کے مفروضہ حریف کے خلاف جھوٹے مضامین شائع کرے تو اس کو روکنا تو درکنار، وہ اس کو لطف لے کر پڑھیں گے اور ان کے معتقدین اُس کو ہر طرف پھیلائیں گے ——— کیسے عجیب ہیں وہ حاملینِ اسلام جو حاملینِ کفر کے اخلاقی معیار پر بھی پورے نہ اتریں۔

شعوری دریافت نہیں

ماہر القادری (۱۹۷۸ - ۱۹۰۶) رسالہ فاران (کراچی) کے اڈیٹر تھے۔ اس کے ساتھ وہ مشہور شاعر بھی ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

پہلے ہر شے کو ہم آواز کیا جاتا ہے   پھر کہیں نغمہ کا آغاز کیا جاتا ہے

یہ شعر زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بتا رہا ہے اور وہ یہ کہ ہر اقدام سے پہلے تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالات موافق بنائے بغیر کوئی نتیجہ خیز عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اجتماعی زندگی میں کسی واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مختلف اجتماعی عوامل کو اس کے موافق بنایا جائے۔ ماحول کو "ہم آواز" بنانے سے پہلے جو "نغمہ" چھیڑا جائے وہ عملاً بے معنی شور ہوگا، وہ دلوں کو کھینچنے والا نغمہ نہیں بن سکتا۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہر القادری کے لیے یہ صرف ایک شاعرانہ نکتہ تھا، وہ ان کی فکری دریافت نہ تھی۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے خود اپنی زندگی میں اس کے برعکس عمل کیا۔ پاکستان بننے کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے وہاں ضروری معاشرتی حالات پیدا کیے بغیر "مطالبہ نظام اسلامی" کی ناکام مہم شروع کر دی۔ گویا انھوں نے چیزوں کو ہم آواز کیے بغیر نغمہ کا آغاز کر دیا۔ مگر ماہر القادری نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اس بے فائدہ مہم میں ان کی پوری تائید کی۔ حالاں کہ ان کے مذکورہ شعر کا تقاضا تھا کہ وہ ان پر تنقید کریں۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "مشاعرہ" کی سطح پر اچھی اچھی باتیں کہتے ہیں، مگر وہ حقیقی عمل کی سطح پر ان کو اختیار نہیں کر پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ باتیں ان کی فکری دریافت نہیں ہوتیں۔ وہ موقع کی مناسبت سے ان باتوں کو لفظی طور پر بول دیتے ہیں مگر وہ ان کے فکر کا حصہ نہیں ہوتی۔ وہ ان کی سوچی سمجھی رائے نہیں ہوتی جس سے ہٹنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

کسی بات کو شعوری فکر کے طور پر پانا ایک چیز ہے اور تقریر یا تحریر میں لفظی طور پر اس کو بول دینا بالکل دوسری چیز۔ کوئی حقیقت اسی وقت آدمی کے ذہن کا جزء بنتی ہے جب کہ وہ اس کو شعوری طور پر پالے۔ اور کوئی حقیقت آدمی کے عمل میں صرف اس وقت شامل ہوتی ہے جب کہ اس نے اس حقیقت کو شعوری طور پر پایا ہو۔

یوٹرن کی ضرورت

سینٹ لوئی (Saint Louis) امریکہ کا ایک شہر ہے۔ یہاں کی سڑکوں پر اگر آپ چلیں تو ایک مقام پر آپ جلی حرفوں میں ایک بورڈ دیکھیں گے جو ٹریفک محکمہ کی طرف سے وہاں لگایا گیا ہے۔ اس بورڈ پر لکھا ہوا ہے ـــــ اگر تم غلط سمت میں چل پڑے ہو تو خدا یوٹرن کی اجازت دیتا ہے:

If you're headed in the wrong direction, God allows U-turns.

یوٹرن کا مطلب ہے انگریزی حرف یو (U) کی صورت میں واپسی۔ اگر آپ سڑک پر پچھم کی طرف اپنی گاڑی دوڑا رہے ہوں۔ پھر آپ کو معلوم ہو کہ آپ الٹے رخ پر سفر کر رہے تھے۔ اس کے بعد آپ اپنی گاڑی کو روکیں اور سفر کا رخ بدلنے کے لئے اپنی گاڑی کو موڑ کر اس کا انجن پچھم کے بجائے پورب کی طرف کر دیں تو اسی کو ٹریفک اصطلاح میں یوٹرن کہا جاتا ہے۔

یوٹرن کا یہ اصول صرف سڑک کے سفر کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہی اصول زندگی کے وسیع تر سفر کے لئے بھی ہے۔ زندگی میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی مطلوب رخ کے برعکس رخ پر دوڑنے لگتا ہے۔ اس وقت ضروری ہو جاتا ہے کہ عمل کا رخ موڑنے کے لئے یوٹرن کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

یوٹرن (U-turn) کا یہ طریقہ فطرت کا طریقہ ہے اور وہ خود اسلام میں بھی بتایا گیا ہے۔ وہ رسول اور اصحاب رسول کی سنتوں میں سے ایک اہم سنت ہے۔ مثلاً عمرۂ حدیبیہ (۶ ھ) کے سفر میں اسلامی قافلہ کا نشانہ یہ تھا کہ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں۔ مگر قریش کی طرف سے مزاحمت پیش آنے کے بعد آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ آپ حدیبیہ کے مقام سے لوٹ کر مدینہ واپس چلے آئے۔ یہ گویا یوٹرن کی ایک عملی مثال تھی۔

اسی طرح غزوہ موتہ (۸ ھ) میں جب کئی صحابہ کی شہادت کے بعد حضرت خالد کو اسلامی لشکر کا سردار بنایا گیا تو حالات کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے طے کیا کہ میدان جنگ سے لوٹ کر مدینہ چلے جائیں۔ اصحاب رسول کا یہ واپسی کا سفر بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے یوٹرن کی ایک مثال ہے۔

یوٹرن کا اصول جس طرح سڑک کے سفر کو نتیجہ خیز اور بامقصد بنانے کے لئے ضروری ہے، اسی طرح زندگی کے سفر میں بھی اس کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ زندگی کا سفر بھی اسی وقت بامقصد

اور نتیجہ خیز بنتا ہے جب کہ آدمی حسب ضرورت یو ٹرن لینے کے لئے تیار رہے۔

زندگی کا سفر ہمیشہ خار دار اور ناہموار وادیوں میں طے ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے ذہنی آئیڈیل کو خارجی حالات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بار بار نیا فیصلہ لینا پڑتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ابتدائی اندازہ کے مطابق اقدام کا ایک نقشہ بناتا ہے۔ مگر عملی تجربہ کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نقشہ اولاً درست ہونے کے باوجود پیش آمدہ حالات میں قابل عمل نہیں تھا۔

ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی تدبیر کار کے اعتبار سے یو ٹرن لے۔ یعنی ابتدائی اصول پر اپنے یقین کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی حکمت عملی کو حالات کے تقاضے کے پیش نظر تبدیل کرے۔ اس طرح ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی اندازہ میں جو نقشۂ کار اقدام کی صورت میں وضع کیا گیا تھا، حالات کے گہرے مطالعہ کے بعد اس کو بظاہر پسپائی میں تبدیل کرنا پڑتا ہے۔

تاہم جس طرح سڑک کے سفر میں یو ٹرن کا مطلب حقیقۃً سمت سفر کی تبدیلی ہوتا ہے نہ کہ خود سفر کو موقوف یا معطل کرنا۔ اسی طرح زندگی کے سفر میں بھی یو ٹرن کا مطلب سفر کو روکنا یا پسپائی اختیار کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ تمام تر عمل کا رخ بدلنے کے ہم معنی ہے۔ یہ فرق دراصل اتجاہ (direction) کے اعتبار سے ہے نہ کہ خود عمل اور اقدام کے اعتبار سے۔ کیوں کہ عمل یا اقدام تو بہر حال دونوں صورتوں میں جاری رہتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس یہی ہے۔ آج مسلمان بھی ٹھیک اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے احیاء اسلام اور احیاء ملت کے لئے بے شمار جانی اور مالی قربانیاں دیں۔ مگر ان کی تمام قربانیاں رائیگاں ہو کر رہ گئیں۔

کوششوں کا اس طرح بے نتیجہ ہو جانا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ خود کوشش میں کسی بنیادی خامی کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوششوں کا جو رخ اختیار کیا گیا وہ صحیح رخ نہ تھا۔ ایسی حالت میں انتہائی ضروری ہو گیا ہے کہ نیا فیصلہ لیا جائے۔ یو ٹرن کے ذریعہ اپنی کوششوں کے رخ کو صحیح سمت میں موڑ دیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو اب یہی یو ٹرن لینا ہے۔ بعض اسباب سے موجودہ زمانہ میں ساری

دنیا کے مسلمانوں میں منفی سوچ ابھر آئی۔ اس سوچ کو ہمیں بدلنا ہے اور دوبارہ مسلمانوں کے اندر مثبت سوچ پیدا کرنا ہے۔ یہی ان کے لئے یوٹرن ہے، اور اسی میں ان کی تمام ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

اس منفی ردعمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری قومیں مسلمانوں کو دشمن کے روپ میں دکھائی دینے لگیں۔ انھوں نے ان قوموں سے جہاد کے نام پر ٹکراؤ شروع کر دیا۔ مفروضہ دشمنوں کے خلاف یہ جہاد کہیں شکایت اور احتجاج کی صورت میں جاری ہے اور کہیں جنگ اور ٹکراؤ کی صورت میں۔ مگر غیر معمولی کوشش اور بے پناہ قربانی کے باوجود مسلمانوں کی یکطرفہ بربادی بتاتی ہے کہ ہمارے رہنماؤں کا یہ فیصلہ حالات کے مطابق نہ تھا۔ یہ الٹے رخ پر سفر کرنے کے ہم معنی تھا۔

اب مسلمانوں کی رستگاری اور کامیابی کی ایک ہی صورت ہے، اور وہ بلاشبہ یوٹرن ہے۔ یعنی اپنی سوچ اور اپنی کوشش کے رخ کو بدلنا۔ جہاد کے رخ سے پلٹ کر دعوت کے رخ پر اپنی محنتیں صرف کرنا۔ یہی عقل کا تقاضا ہے اور یہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

اسلامی عمل (Islamic activism) دراصل دعوتی عمل (Dawa activism) ہے۔ اسلام کا اقدامی عمل دعوت ہے نہ کہ جہاد بمعنی ٹکراؤ۔ اسلام کا مقصد دوسری قوموں کو خدا کے دین رحمت کا مخاطب بنانا ہے نہ کہ ان کو دشمن قرار دے کر ان سے لڑائی شروع کر دینا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں صبر کی بے حد اہمیت ہے۔ کیوں کہ صبر کے بغیر دعوت کا عمل ممکن ہی نہیں۔ داعی کو مدعو کی زیادتیوں پر یکطرفہ صبر کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی دعوت کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

آج مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہو گیا ہے کہ وہ خارجی احتجاج کو چھوڑیں اور اپنی ساری طاقت داخلی تعمیر پر لگا دیں۔ دوسری قوموں کو وہ دشمن کے بجائے مدعو کے روپ میں دیکھیں۔ ہتھیار کو چھوڑ کر وہ اسلام کی نظریاتی طاقت پر بھروسہ کریں۔ سیاسی انقلاب کے بجائے اخلاقی انقلاب کو وہ اپنی جدوجہد کا نشانہ بنائیں۔ ٹکراؤ کے بجائے صبر و اعراض کی بنیاد پر وہ اپنی ملی پالیسی کی تشکیل کریں۔ قوموں کے خلاف بد دعا کرنے کے بجائے وہ سب کے حق میں دعائے خیر و ہدایت کا اہتمام کریں۔

الٹے رخ پر چل پڑنے والے مسافر کی نجات کا واحد طریقہ یوٹرن ہے۔ اسی طرح جو انسانی قافلہ الٹے رخ پر اپنی محنت صرف کرنے لگے، اس کی کامیابی کا بھی واحد راز یہی ہے کہ وہ یوٹرن لے کر اپنی محنت کے رخ کو درست کرے۔ ورنہ اس دنیا میں اس کے لئے تباہی اور بربادی کے سوا کوئی اور انجام نہیں۔

یہ بے خبر لوگ

ایک دیہاتی کسان ایک عالم کے پاس آیا۔ اس نے خوش ہو ہو کر عالم سے بیان کیا کہ میں نے سارا قرآن خود سے پڑھ لیا ہے۔ سب صحیح ہے، کہیں کوئی غلطی نہیں ہے۔ صرف ایک جگہ کھٹک ہے۔ اسی کو آپ کے پاس پوچھنے آیا ہوں۔ عالم نے پوچھا کہ کہاں تم کو کھٹک ہے۔ کسان نے کہا کہ ایک سورہ کے ایک لفظ میں۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ لفظ وَالْفَتْحُ ہے یا وَالْقَبْحُ۔ عالم نے کہا کہ دکھاؤ تو انھوں نے تیسواں پارہ کھولا اور سورہ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ کو پڑھنا شروع کیا:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْقَبْحُ

عالم یہ سن کر ہنس پڑے اور کئی روز تک اس کو سوچ سوچ کر ہنستے رہے۔

یہ صرف ایک دیہاتی کا قصہ نہیں ہے۔ یہی بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کا قصہ بھی ہے۔ خود میرے ساتھ بار بار ایسا پیش آتا ہے کہ ایک شخص خط کے ذریعہ یا زبانی یہ کہے گا کہ میں نے اسلام پر بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور بہت سی تقریریں سنی ہیں۔ بس ایک معاملہ میں میرا ذہن اٹکا ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ عجیب وغریب قسم کے مسائل بیان کرے گا جن کا تعلق نہ دنیا کی فلاح سے ہوگا نہ دین کی فلاح سے۔

مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، تو خدا ہر جگہ اپنے علم کے ذریعہ حاضر ہے یا اپنی ذات کے ذریعہ۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ موجود ہیں اور وہاں نماز پڑھتے ہیں تو آپ روزہ اور حج بھی ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ میں نے پورے قرآن کا ترجمہ پڑھ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن آسمانِ دنیا پر بیک وقت نازل کر دیا گیا۔ پھر جزء جزء کر کے ۲۳ سال میں اترا تو قرآن آسمان دنیا پر کتاب کی صورت میں تھا یا آواز کی صورت میں۔ وغیرہ

قرآن کو پڑھنے والا وہ ہے جس کو قرآن پڑھ کر عاقبت کی فکر لگ جائے۔ جو ہمہ تن اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جو اپنی ذات کا احتساب کرنے لگے۔ جو لوگ مذکورہ قسم کے مسائل میں الجھے ہوئے ہوں انھوں نے ابھی قرآن کو پڑھا ہی نہیں۔

قرآن حقائق کی کتاب ہے نہ کہ کسی قسم کے طلسمات کی کتاب۔

تعمیری انقلاب

جرمنی نے ہٹلر (۱۹۴۵-۱۸۸۹) کی قیادت میں تخریبی لاوا تیار کیا۔ یہ لاوا جب پھٹا تو اس سے جرمنی کو اور دوسرے ملکوں کو صرف تباہی حاصل ہوئی۔

اس کے برعکس مثال جاپان کی ہے۔ جاپان میں ہیرو ہیٹو (۱۹۸۹-۱۹۰۱) کی قیادت میں تعمیری لاوا پکایا گیا۔ یہ لاوا تیار ہو کر جب پھٹا تو اس نے دنیا کو بہترین صنعتی پیداوار کا تحفہ دیا۔ جرمنی سے ساری دنیا کو صنعتی کانٹے ملے تھے، جاپان نے ساری دنیا کو صنعتی پھولوں سے بھر دیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "لاوا" تیار کرنا کیا ہے۔ اور ایک قسم کا لاوا پھٹنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور دوسرے قسم کا لاوا پھٹنے کا نتیجہ کیا۔

اسلام کی تحریک بھی ایک لاوا تیار کرنے کی تحریک ہے۔ اسلامی تحریک کا نشانہ افراد ہوتے ہیں۔ اسلامی تحریک افراد کے ذہن میں انقلاب پیدا کرتی ہے۔ پھر پوری سوسائٹی انقلابی خیالات سے بھر جاتی ہے۔

یہ گویا ایک قسم کا تعمیری لاوا ہے۔ یہ لاوا تیار ہو کر جب پھٹتا ہے تو وہ پورے ملک کو اور آخرکار پوری دنیا کو اپنی برکتوں سے بھر دیتا ہے۔

اسلام کی تحریک مکمل طور پر ایک تعمیری تحریک ہے۔ وہ اول تا آخر تعمیری لاوا تیار کرنے پر مرتکز رہتی ہے۔ تخریب کاری کا طریقہ اسلامی تحریک کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اس قسم کا طریقہ اسلام کی نفی ہے نہ کہ اسلام کا اثبات۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اور دانشور اٹھے، وہ زیادہ تر زمانہ کے سیاسی افکار سے متاثر تھے۔ موجودہ زمانہ کی سیاسی تحریکوں نے نظام (System) کے توڑنے کو اپنا نشانہ بنا رکھا۔ اسی کے زیر اثر مسلم رہنماؤں نے بھی یہ سمجھ لیا کہ پہلا کام وقت کے نظام کو توڑنا ہے۔ اس کے بعد ہی اسلامی نظام کا قیام عمل میں آسکتا ہے:

چوں نظامِ کہنہ آباداں کنند　　اولاً تعمیر را ویراں کنند

اس نظریہ نے اسلامی تحریک کو عملاً تخریبی لاوا پکانے کی راہ پر ڈال دیا۔ رحمت کا دین زحمت کا دین بن گیا، جس کا برا ذائقہ آج ساری دنیا چکھ رہی ہے اور خود مسلمان بھی۔

عالی ظرفی

مولانا ابوالجلال ندوی (۱۹۸۴-۱۸۹۱) غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ وہ اردو، عربی فارسی، انگریزی، ہندی، سنسکرت اور عبرانی زبانیں جانتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا مگر وہ کوئی کتاب مکمل نہ کر سکے۔ اس کی وجہ ان کے اندر استقلال کی کمی تھی۔

۱۹۲۸ میں اور اس کے بعد وہ مدراس کے مدرسہ جمالیہ کے پرنسپل تھے۔ مولانا ابوالجلال صاحب کے دور میں ایک دفعہ دستار بندی کے جلسہ میں نواب حیدر آباد کو بھی یہاں مدعو کیا گیا تھا، وہ معائنہ کی غرض سے دو نوجوان لڑکیوں کے ہمراہ ہر درجہ میں تشریف لے گئے، جس درجہ میں پہنچے سب لوگ ان کے احترام میں ایستادہ ہو جاتے، مولانا ابوالجلال صاحب کے درجہ میں تشریف لائے تو وہ نہ خود کھڑے ہوئے اور نہ طلبہ کو کھڑے ہونے دیا بلکہ اپنا رخ بھی پھیر لیا۔ نواب صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کیوں نہیں اٹھے۔ کیا میں ظل اللہ نہیں ہوں اور آپ نے رُخ پھیر کر میری توہین کی، مولانا ابوالجلال صاحب نے فرمایا کہ میں آپ سے زیادہ برتر کتاب حدیث شریف کا درس دے رہا تھا اور آپ کے ساتھ نا کتخدا لڑکیاں تھیں اس لئے رخ پھیر لیا۔ نواب صاحب کو اس موقع پر گیارہ تولہ سونا کا ایک ہار پہنایا گیا تھا، انھوں نے اتار کر مولانا کو دے دیا اور مولانا نے اسے مدرسہ کے چندہ میں جمال صاحب کے حوالہ کر دیا۔

نواب صاحب نے مولانا سے یہ بھی فرمایا تھا کہ آپ کو ضرورت ہو تو میرے پاس حیدر آباد تشریف لائیں۔ یہ جب وہاں گئے تو نواب صاحب نے کوئی کتاب انھیں ترجمہ کے لئے دی۔ مولانا نے دو ماہ میں ترجمہ کر کے ان کے حوالہ کر دیا، نواب صاحب کو ترجمہ بہت پسند آیا اور مولانا کی تنخواہ کے حساب سے نو سو روپے بھی مرحمت فرمائے جسے لے کر یہ واپس چلے آئے۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، اگست ۱۹۹۴، صفحہ ۱۱۳-۱۱۲)

یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب کہ نواب حیدر آباد کا شاہانہ جاہ و جلال تھا۔ ایک آدمی نے برسرِ عام ان کی توہین کی۔ مگر انھوں نے نہ صرف توہین کو برداشت کیا بلکہ اس آدمی کے جواب سے خوش ہو کر اس کو انعام و اکرام بھی دیا۔ اسی کا نام عالی ظرفی ہے۔

جدالِ احسن

گفتگو کے اسلامی آداب میں سے ایک وہ اصول ہے جس کو قرآن میں دفع احسن (المومنون ۹۶) یا جدال احسن (النحل ۱۲۵) کہا گیا ہے۔ یعنی مخالفانہ باتوں کے جواب میں ردعمل یا مناظرہ بازی کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ بلکہ احسن طریقہ سے اس کو ٹال دینے یا اس سے گزر جانے کی کوشش کی جائے۔ اس طریقہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت رکھی ہے کہ وہ لوگوں کو مسخر کر لے۔ اس میں نہ صرف وقتی طور پر دفع شر کا فائدہ ہے، بلکہ قرآن کی شہادت کے مطابق، وہ شر کو خیر میں اور دشمن کو دوست میں تبدیل کرنے کا نہایت موثر ذریعہ ہے (حم السجدہ ۳۴)

جدالِ احسن کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے قرآن کی ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید کا ذکر ہے اور اس مکالمہ کا تذکرہ ہے جو آنجناب کا وقت کے بادشاہ نمرود سے پیش آیا۔ اس مکالمہ کا ایک حصہ یہ ہے:

کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارہ میں حجت کی۔ کیوں کہ اللہ نے اس کو سلطنت دی تھی۔ جب ابراہیم نے اس سے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ وہ شخص بولا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے، تم اس کو پچھم سے نکال دو۔ تب وہ منکر حیران رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا (البقرہ ۲۵۸)

نمرود نے حضرت ابراہیم کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں اس لئے خود تمہارے معیار کے مطابق میں رب ہوں۔ یہ واضح طور پر سرکشی کا ایک جملہ تھا۔ مگر حضرت ابراہیم اس پر بادشاہ سے نہیں الجھے۔ انھوں نے بات کو بدل کر یہ فرمایا کہ اچھا، اگر تم رب ہو تو یہاں صبح وشام، بالفاظ دیگر، گردش زمین کا جو آفاقی نظام قائم ہے اس کو تم بدل کر دکھا دو۔ اس انداز کلام نے بادشاہ کو لاجواب کر دیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے عام طور پر اس اسلامی اصول کو بھلا دیا ہے۔ اس لئے وہ غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو مشکلات میں پھنسا ہوا محسوس کرتے

ہیں۔ اگر وہ اسلام کے اس انداز کلام کو اختیار کرلیں تو اچانک وہ اپنے آپ کو اقدامی پوزیشن میں محسوس کرنے لگیں گے، جب کہ آج وہ خلاف واقعہ طور پر اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں گھرا ہوا پا رہے ہیں۔

ہندستان میں کچھ انتہا پسند لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندستانی کا تشخص ہندو ہے۔ یعنی فرانس کے شہری کو جس طرح فرنچ یا امریکہ کے شہری کو جس طرح امریکن کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندستان کے ہر شہری کو ہندو کہا جانا چاہئے۔ اس پر مسلمان غصہ ہوتے ہیں۔ مسلم دانشور اس کا حوالہ دے کر تیز و تند مضامین اخباروں اور رسالوں میں شائع کرتے ہیں۔

مگر یہ جدال غیر احسن ہے۔ اس معاملہ میں جدال احسن کا طریقہ یہ ہے کہ نزاع کے بجائے اعراض کا انداز اختیار کیا جائے۔ منفی جواب کے بجائے مثبت جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ اگر سوچ کو قرآن کے بتائے ہوئے رخ پر چلایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا نہایت عمدہ اور موثر جواب یہاں موجود ہے۔

راقم الحروف کی گفتگو ایسے ہی ایک انتہا پسند ہندو سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس دیش میں سب کی پہچان صرف ایک ہے، اور وہ ہندو ہے۔ ہندو، کوئی دھارمک شبد نہیں، وہ جغرافی شبد ہے۔ جو لوگ بھی بھارتی جغرافیہ میں بستے ہیں وہ سب کے سب ہندو ہیں۔

میں نے نرمی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ شہریت کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس کا فیصلہ کانسٹی ٹیوشن کرتا ہے۔ مثلاً اس دیش کا نام کیا ہو، اس کو کوئی پارٹی طے نہیں کرسکتی۔ کانسٹی ٹیوشن نے دیش کا جو نام مقرر کیا ہے وہی دیش کا نام ہوگا۔ اسی طرح دیش کے شہری کو کیا کہا جائے، یہ بھی ساری دنیا کے مانے ہوئے اصول کے مطابق، کانسٹی ٹیوشن کے دائرہ کی چیز ہے۔ اور کانسٹی ٹیوشن ہی اس کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہمارا موجودہ کانسٹی ٹیوشن اس دیش کے باشندوں کو "انڈین" کہتا ہے۔ آدمی کے پاسپورٹ میں، اس کے قانونی کاغذات میں ہر جگہ اس کی شہریت انڈین ہی بتائی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی چاہے یا نہ چاہے، اس ملک کے ہر آدمی کو انڈین ہی کہا جائے گا اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب کہ خود کانسٹی ٹیوشن ہی تبدیل کر دیا جائے۔

پھر میں نے کہا کہ اگر کچھ لوگ ہندستان کے کانسٹی ٹیوشن میں اس قسم کی تبدیلی لانا چاہیں تو

یقینی طور پر خود ہندؤوں کی اکثریت اس کی مخالفت کرے گی۔ کیوں کہ یہ بات انٹرنیشنل معیار کے مطابق نہیں۔ کانسٹی ٹیوشن ہمیشہ پڑھے لکھے لوگ بناتے ہیں، اور پڑھے لکھے لوگ اس طرح کے معاملات میں انٹرنیشنل معیار سے باہر جانے کی بات سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیوں کہ ایسا کرنا اپنے آپ کو عالمی اچھوت بنانے کے ہم معنی ہے۔

یہی معاملہ کامن سول کوڈ کا ہے۔ مسلم دانشور اکثر اس کے خلاف ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں بھی جدال احسن کے اصول پر ہمارے پاس نہایت مؤثر جواب موجود ہے۔

ایک پریس کانفرنس میں مجھ سے اس کی بابت پوچھا گیا۔ میں نے کہا کہ کامن سول کوڈ ہمارے ملک میں صرف اخباری اشو ہے، وہ کوئی حقیقی اشو نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کا سماج مکمل طور پر ایک روایت پسند (tradition-based) سماج ہے۔ جب تک سماجی روایتیں نہ بدلیں، محض قانون بنا دینے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس قسم کی چیزیں کبھی قانون کے ذریعہ نافذ نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں اینٹی ڈاوری قانون موجود ہے۔ مگر اس قانون کے باوجود ڈاوری بڑھ رہی ہے اور قانون اس کو روکنے سے مکمل طور پر عاجز ہے۔

اگر کامن سول کوڈ کے نام پر کوئی سخت قانون بنا دیا جائے اور اس کے مطابق اس کو لازمی قرار دے دیا جائے کہ تمام فرقوں کے نکاح سرکاری شادی خانہ میں انجام دیے جائیں تو عملی طور پر اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ تمام لوگ پھر بھی اپنے آبائی رواج کے مطابق ہی نکاح کریں گے۔ بالفرض اگر انھیں سرکاری شادی خانوں میں جانے پر مجبور کر دیا جائے تب بھی وہاں سے لوٹنے کے بعد ہندو فوراً پنڈت کو بلا کر پھیرا کروائے گا اور مسلمان قاضی کو بلا کر اس سے نکاح پڑھوائے گا۔ ایسی حالت میں قانون بنانے سے کیا فائدہ۔

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ ملک کے کانسٹی ٹیوشن میں ایک دفعہ کامن سول کوڈ کی موجود ہے۔ مگر یہ کوئی دلیل نہیں۔ کانسٹی ٹیوشن میں اور بھی کئی غیر حقیقی دفعات تھیں (مثلاً پریوی پرس) لیکن آپ جانتے ہیں کہ ترمیم کر کے ان دفعات کو نکال دیا گیا یا بدل دیا گیا۔ اس طرح اب تک کانسٹی ٹیوشن میں ۷۰ سے زیادہ ترمیمات ہو چکی ہیں۔

جدال احسن نزاع کو گھٹاتا ہے اور جدال غیر احسن صرف نزاع کو بڑھانے میں مددگار ہے۔

امن کی ضرورت

۲۵ جون ۱۹۹۴ کو دہلی میں ایک عرب پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران کسی وجہ سے یہ ذکر آیا کہ اگست کے پہلے ہفتہ میں مجھے لندن جانا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ کس لئے۔ میں نے کہا کہ ایک بین اقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا کہ اس کانفرنس کا موضوع بحث کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ امن (سلام) انھوں نے فوراً کہا: السلام بَین مَن بین القوی والضعیف او بین الظالم والمظلوم (امن کن لوگوں کے درمیان۔ کیا طاقتور اور کمزور کے درمیان یا ظالم اور مظلوم کے درمیان)

میں نے کہا کہ اصل سوال یہ نہیں کہ امن کن لوگوں کے درمیان۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ امن کس مقصد کے لئے (لیست القضیة، السلام بَین مَن۔ وانما القضیه هی، السلام لِاَیّ غرض)

آجکل کے مسلم دانشوروں کے ذہن پر یہ چھایا ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان پر ہر جگہ زیردست ہیں اور غیر مسلم قومیں ہر جگہ ان پر غالب ہیں۔ ایسی حالت میں جو امن ہوگا وہ دو نامساوی فریقوں کے درمیان ہوگا۔ یہ گویا فریق ثانی کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حیثیت کو تسلیم کرلینا ہے۔ پھر ایسا کھلا ہوا گھاٹے کا معاملہ ہم کیونکر کرسکتے ہیں۔

مگر یہ سوچ کا غلط رخ ہے۔ صحیح رخ یہ ہے کہ ہم سوچیں کہ آج ہم کو وقفۂ امن کی ضرورت ہے۔ ہم سو برس سے بھی زیادہ عرصہ سے فریق ثانی سے ٹکراؤ کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ ٹکراؤ، غیر معمولی قربانیوں کے باوجود، صرف ہماری مزید تباہی کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقابلہ میں وہ ہتھیار غیر استعمال شدہ پڑا ہوا ہے جو ہمارا سب سے زیادہ طاقت ور ہتھیار تھا۔ یعنی اسلام کی برتر آئیڈیالوجی۔ مگر اس ہتھیار کے استعمال کے لئے معتدل فضا درکار ہے، اور معتدل فضا صرف امن کے حالات میں قائم ہوتی ہے۔ داعی قوم اور مدعو قوم کے درمیان معتدل حالات قائم کرنا اسلام کے دعوتی عمل کو زندہ ہونے کا موقع دینا ہے، اور جب اسلام کا دعوتی عمل موافق فضا میں جاری ہوجائے تو کوئی چیز نہیں جو اسلام کو غلبہ کی منزل تک پہنچنے سے روک سکے۔

اس دنیا میں تمام فیصلے خدا کی طرف سے کئے جاتے ہیں، اور جب خدا کا فیصلہ آتا ہے تو تمام انسانی نشانات اس طرح مٹ جاتے ہیں جیسے کہ وہ ایک تنکا تھا جو طوفان کی رو میں بہہ گیا۔

پروفیسر انیس قاری نے بتایا کہ یہاں لوگ مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔ اور اکثر بظاہر معمولی سی چیز ان کے قبول اسلام کا سبب بن جاتی ہے۔ مثلاً ایک انگریز نے اسلام قبول کیا۔ قاری صاحب نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیوں اسلام قبول کیا۔ اس نے کہا کہ اسلام کی ایک چیز نے مجھ کو بہت متاثر کیا، اور وہ پانچ وقت وضو (5 time ablution) ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ مذہب کتنا اچھا ہوگا جو آدمی کو روزانہ پانچ وقت صفائی کرنا سکھائے۔ ایک اور نومسلم سے انھوں نے پوچھا اس نے بتایا کہ میں نے قرآن کو دیکھا تو میں نے پایا کہ اس میں کوئی سورہ محمد کی فیملی (عائشہ، فاطمہ) کے نام پر نہیں ہے۔ جب کہ قرآن کی ایک پوری سورہ کا نام مریم ہے۔ یہ چیز مجھ کو قرآن کے دین کی طرف لانے کا سبب بنی۔

پارک روڈ کی مرکزی مسجد کے بورڈ پر انگریزی روزنامہ سن (The Sun) کے شمارہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۲ کے ایک صفحہ کی فوٹو کاپی لگی ہوئی تھی۔ اس باتصویر رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ برطانی ایکٹرس میریا بیکر پالین (Maria Baker Pawline) کی ۲۸ سالہ لڑکی لوئی پالین (Louise Pawline) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ وہ حجاب کے ساتھ اسلامی لباس پہنتی ہے اور گھر کے اندر رہ کر اپنے گیارہ سالہ بچہ کی تربیت اور نگہداشت میں وقت گزارتی ہے۔ اس نے ایک مصری طالب علم ممدوح بریکہ (۳۵ سال) سے نکاح کر لیا ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے مکان میں دونوں بالکل سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ دونوں پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں خبر کی سرخی ان الفاظ میں تھی کہ بیٹی نے اپنی ماں کا مذہب چھوڑ دیا:

Louise turns her back on mum's faith.

میں نے اس خبر کو پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ حدیث رسول موجودہ زمانہ میں واقعہ بن رہی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ زمین کی سطح پر کوئی چھوٹا یا بڑا گھر نہیں بچے گا مگر یہ کہ اللہ اسلام کے کلمہ کو اس میں داخل کر دے گا۔

دی سنڈے ٹیلی گراف (لندن) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس پر لکھنے والے کا نام فرانس ویش

(Frances Weich) درج تھا۔ یہ مضمون مسٹر نراد چودھری کے بارہ میں تھا۔ نراد چودھری ۱۸۹۷ میں بنگال میں پیدا ہوئے۔ ان کو انگریزی لٹریچر سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ ۱۹۵۵ میں وہ پہلی بار انگلینڈ گئے۔ پچھلے ۲۲ سال سے وہ مستقل طور پر یہاں ہیں اور آکسفورڈ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ ان چند ہندستانیوں میں سے ایک ہیں جن کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ پرفکٹ انگلش لکھتے ہیں۔ اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعہ ان کو جو محدود آمدنی ہوتی ہے، اسی پر وہ گزر کرتے ہیں اور حد درجہ سادہ زندگی گزارتے ہیں۔

حال ہی میں انھوں نے آکسفورڈ میں ایک تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا کہ برطانیہ میں تہذیب کے زوال کا سبب کیا ہے۔ وہ ڈائس پر کھڑے ہوئے۔ اپنے منھ سے اپنا مصنوعی دانت نکالا اور اس کے بعد حاضرین سے سوال کیا کہ اپنے یہ دانت میں نے کیوں کھودئے :

Why have I lost my teeth?

یعنی یہ سادہ طور پر عمر کا معاملہ ہے۔ ایک فرد بوڑھا ہونے پر اپنے دانت کھو دیتا ہے، اسی طرح قومیں لمبی مدت گزرنے کے بعد عروج کا مقام کھو دیتی ہیں۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے، اور برطانیہ اس وقت اسی قانون فطرت کی زد میں ہے۔

لندن میں پروفیسر انیس قاری نے بتایا کہ ایک انگریز ان کا ملاقاتی ہے۔ اس کا نام ڈاکٹر مارٹن (Dr Martin) ہے۔ وہ اچھی اردو جانتا ہے۔ حتی کہ اس نے ایم اے اور ڈاکٹریٹ اردو میں کیا ہے۔ قاری صاحب نے اس سے پوچھا کہ تم نے اردو کیسے پڑھی۔ اس نے بتایا کہ نوجوانی کی عمر میں جاب کی تلاش میں بریڈ فورڈ گیا۔ وہاں میں نے ایک مسلمان کا مکان کرایہ پر لیا۔ یہ پاکستان (میرپور) سے آیا ہوا ایک مسلمان تھا۔ معمولی پڑھا لکھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ابھی میرے پاس جاب نہیں ہے تو اس نے مجھ سے کرایہ بھی نہیں مانگا۔ اس نے کہا کہ جب جاب مل جائے تو کرایہ دے دینا۔ اگلے مہینہ مجھے جاب مل گیا تب بھی اس نے مجھ سے کرایہ نہیں لیا۔ اس نے کہا کہ ابھی تم کو پہلی تنخواہ ملی ہے۔ تم کو کام ہوگا، تم اپنا کام چلاؤ۔ آئندہ مجھے دیدینا۔

مسلمان کے اس غیر معمولی سلوک کا ڈاکٹر مارٹن پر بہت اثر پڑا۔ انھوں نے سوچا کہ مجھے اس زبان کو پڑھنا چاہئے جو اس عجیب آدمی کی زبان ہے۔ تاکہ اس کے کلچر سے مجھے واقفیت ہو۔ چنانچہ

وہ پاکستان اور انڈیا گئے۔ انھوں نے باقاعدہ داخلہ لے کر اردو پڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹریٹ تک اردو پڑھ ڈالی۔ اب وہ برطانیہ کے کسی تعلیمی ادارہ میں اردو کے استاد ہیں۔

ہندو اور مسلمان اور سکھ بڑی تعداد میں برطانیہ میں آباد ہیں۔ یہاں کے مادی فائدے ان کو یہاں لائے اور انھوں نے یہاں کی شہریت اختیار کر لی۔ مگر ہر ایک کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی اگلی نسل اپنے آبائی مذہب اور کلچر سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ صورت حال ہر ایک کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ یہاں کی مادی کشش انھیں برطانیہ چھوڑنے میں مانع بن رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اپنے بچوں کے تہذیبی مستقبل کے بارہ میں وہ مستقل طور پر تردد میں رہتے ہیں۔

اس کا حل تینوں فرقوں نے یہ نکالا ہے کہ وہ اپنے اپنے اسکول کھول رہے ہیں۔ کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ اپنے بچوں کو اپنے قدیم کلچر پر باقی رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر مجھے اس کوشش کا کوئی واقعی مستقبل نظر نہیں آتا۔ میں نے ایک صاحب سے کہا: کلچرل سیلاب کا مقابلہ آپ لوگ کلچرل تحفظ سے کرنا چاہتے ہیں۔ مگر تحفظ کی تدبیر کبھی اقدامی یلغار کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر سابق سوویت یونین کی طرح یہاں جبر ہو رہا ہوتا تو آپ کامیاب ہو سکتے تھے۔ مگر یہاں تو آپ کی نسلیں خود اپنی رغبت سے مغربی کلچر کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ ایسی حالت میں آپ کی روایتی قسم کی تحفظاتی کوشش کس طرح موثر ہو سکتی ہے۔

۲۷ ستمبر کو لندن سے واپسی تھی۔ پروفیسر انیس قاری کے ساتھ ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ انھوں نے سیدھے ایرپورٹ جانے کے بجائے مختلف راستے اختیار کئے تاکہ لندن کے اہم مقامات دیکھے جا سکیں۔ ہماری گاڑی مختلف راستوں سے گزر رہی تھی اور پروفیسر انیس قاری سڑک کے دونوں طرف کھڑی ہوئی بلڈنگوں کا تعارف کراتے جا رہے تھے ـــــــ یہ ٹاور برج ہے، یہ ۱۰ ڈاوننگ اسٹریٹ ہے، یہ پارلی منٹ ہاؤس ہے، یہ بگ بینگ ہے، یہ بکنگھم پیلس ہے، یہ ہائڈ پارک ہے، یہ ہیرڈس (Harrods) ہے، یہ البرٹ وکٹوریہ میوزیم ہے، یہ اسماعیلی سنٹر ہے، یہ امپیریل سائنس کالج ہے، یہ آکسفورڈ اسٹریٹ ہے، یہ برٹش میوزیم ہے، یہ لندن یونیورسٹی ہے، یہ سائنس میوزیم ہے، یہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ہے، یہ لندن پلے نیٹیریم ہے، یہ گاندھی گارڈن ہے، یہ ریجنٹ پارک ہے، یہ چڑیا گھر ہے۔ اس طرح وہ ایک ایک چیز بتا رہے تھے اور

میرا ذہن مسلسل ان کے الفاظ کو اپنی یادداشت سے وابستہ کرتے ہوئے انھیں سمجھتا جا رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ دین فطرت کی دعوت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہر آدمی کے لاشعور میں خدا کے دین کا تصور پیشگی طور پر موجود ہے۔ جب ایک داعی خدا کے دین کو بے آمیز روپ میں پیش کرتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ عین وہی چیز ہے جس کا تصور پہلے سے میرے ذہن میں موجود تھا۔ اپنے تصور اور خارجی واقعہ کی یہ مطابقت اس کے لاشعور کو شعور بنا دیتی ہے، وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کا اعتراف کر کے خدا کے بندوں میں شامل ہو جائے۔

راستہ میں ایسٹ لندن کی مسجد تھی۔ عین سڑک کے کنارے کافی بڑی اور شاندار مسجد ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ پارک روڈ پر پہنچے تو وہاں لندن کی مرکزی مسجد تھی۔ یہ مسجد اور مرکز عربوں نے تعمیر کرایا ہے۔ یہاں ٹھہر کر اندر داخل ہوئے۔ یہ بہت بڑے رقبہ میں واقع ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ جو ایک بڑے گنبد کے نیچے ہال کی مانند ہے، اس کو میں نے ناپا تو ایک طرف ۳۶ قدم اور دوسری طرف ۴۰ قدم تھا۔

یہاں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی۔ نماز پڑھتے ہوئے ایک عجیب احساس ہوا۔ میرے دل نے کہا کہ تحیۃ المسجد در اصل تحیۃ الخالق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیا کے مناظر سے گزر رہا ہے۔ اس کے بعد اس کے سامنے مسجد آتی ہے جو خدا کا عبادت خانہ ہے۔ اس وقت مسجد گویا خاموش زبان میں کہتی ہے کہ خدا کے عظمت و جلال کا اعتراف کرو۔ اس احساس اعتراف کو لئے ہوئے آدمی مسجد کے اندر داخل ہوتا ہے اور بے تابانہ طور پر خدا کے سامنے گر جاتا ہے۔

مسجد کے صحن میں دو ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس پر عطیہ کے کپڑے اور کمبل لدے ہوئے ہیں اور وہ بوسنیا کے ستم رسیدہ مسلمانوں کے لئے بھیجے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ بوسنیا کے حادثہ کے بعد ساری دنیا کے مسلمانوں نے جتنے بڑے پیمانہ پر اپنی ہمدردی کا اظہار کیا ہے، اگر یہی ہمدردی وہ اس سے پہلے بوسنیا میں تبلیغ کے لئے کرتے تو وہاں کے مسلمانوں کی تعداد ۴۳ فیصد سے بڑھ کر شاید ۸۳ فیصد ہو جاتی اور پھر اس قسم کے حادثہ کی جڑ کٹ جاتی۔ مگر مسلمان قومی جذبہ کے تحت خرچ کرنا جانتے ہیں، وہ دعوتی جذبہ کے تحت خرچ کرنا نہیں جانتے۔

۲۷ ستمبر کو برٹش ایرویز کی فلائٹ ۱۵۵ کے ذریعہ لندن سے قاہرہ روانہ ہونا تھا۔ ساری

کارروائی معمول کے مطابق ہوئی۔ لندن سے اس جہاز کی روانگی کا وقت شام کو ساڑھے چار بجے تھا۔ مگر آخر وقت میں اعلان کیا گیا کہ ٹکنکل خرابی کے سبب سے یہ جہاز نہیں جا سکتا۔ اس کے بجائے دوسرا جہاز مسافروں کو لے کر یہاں سے جائے گا۔

دوسرے جہاز کی روانگی میں چھ گھنٹہ سے زیادہ تاخیر ہوگئی۔ یہ چھ گھنٹے شدید کیفیات کے عالم میں گزرے۔ یہ گویا الانتظار اشد من الموت کا منظر تھا۔ آخر کار تمام مسافر دوسرے جہاز میں بٹھائے گئے اور ساڑھے چار گھنٹہ کا سفر طے کرکے ہم لوگ قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر اتر گئے۔

جہاز زمین سے بلند ہوا تو اسکائی وژن (جہاز کے اندر لگے ہوئے ویڈیو) پر ضروری ہدایات تصویر اور آواز کی صورت میں بتائی جانے لگیں۔ اناؤنسر نے کہا کہ آپ ان ہدایات کو غور سے سنیں، خواہ آپ ہوائی جہاز کے مستقل مسافر کیوں نہ ہوں:

Even if you are a regular traveller.

میں نے سوچا کہ دوسری تمام چیزوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جب کوئی بات بتائی جائے تو اس کو اس لئے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ اس کو آپ اس سے پہلے سن چکے ہیں۔ بلکہ اس طرح سننا چاہئے گویا کہ آپ اس کو پہلی بار سن رہے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت ہو وہی شعور کی اعلیٰ ترقی کو پاسکتے ہیں۔

جہاز ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ میں نے اپنی سیٹ کے خانہ سے برٹش ایرویز کا فلائٹ میگزین ہائی لائف (High life) نکالا۔ یہ ستمبر ۱۹۹۲ کا شمارہ تھا۔ اس میں "ورلڈ ٹریول نیوز" کے عنوان کے تحت تاج محل کی تصویر تھی۔ یہ اس عمارت کی ایک خصوصی تصویر تھی اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا:

Photo: courtesy of British Airways — Image Bank.

یعنی تاج محل کا یہ فوٹو ہائی لائف نے برٹش ایرویز کے امیج بینک (تصویری ذخیرہ) سے حاصل کیا ہے۔ یہ باتوں کو خوبصورت الفاظ میں کہنے کا زمانہ ہے۔ اوپر کا فقرہ اس کی ایک مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ایک نئے فتنہ کا اضافہ ہوا ہے، یہ الفاظ کا فتنہ ہے۔ بہت زیادہ باشعور آدمی ہی اس فتنہ سے بچ سکتا ہے۔

قاہرہ ایرپورٹ پر کچھ عرب حضرات موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہوکر جدید قاہرہ پہنچا۔ اس وقت ۲۸ ستمبر کا سورج نکل چکا تھا۔ سفر اگر معمول کے مطابق طے ہوتا تو میں ۲۷ ستمبر کو عشاء کی نماز قاہرہ میں پڑھتا مگر جہاز کی خرابی کی وجہ سے ۲۸ ستمبر کی فجر کی نماز کے وقت بھی میں قاہرہ نہ پہنچ سکا۔

کرسٹوفر کولمبس یورپ اور انڈیا کے درمیان بحری راستہ معلوم کرنے کے لئے نکلا مگر اس کا سمندری جہاز بھٹک کر امریکہ کے ساحل پر پہنچ گیا۔ وہ یورپ سے انڈیا آنے کا راستہ تو معلوم نہ کرسکا۔ مگر اس نے نئی دنیا (امریکہ) کو معلوم کرلیا۔ یہ ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ کا واقعہ ہے۔

آج کولمبس کے نام کے ساتھ یہ لکھا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے امریکی براعظم کو دریافت کیا۔ مگر کولمبس کی اپنی زندگی میں اس کو کوئی عظمت یا قدردانی حاصل نہ ہوسکی۔ یہاں تک کہ ۲۰ مئی ۱۵۰۶ کو وہ مایوسی اور گمنامی کی حالت میں اسپین کے ایک مقام پر مرگیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پندرھویں صدی کے یورپی تاجروں کی اصل خواہش یہ تھی کہ وہ انڈیا پہنچنے کا آسان راستہ معلوم کریں۔ کیوں کہ انڈیا کو وہ اپنی تجارت کے لئے بہت مفید سمجھتے تھے۔ انڈیا سے وہ تمباکو، سونا اور مسالہ وغیرہ لے کر جاتے تھے اور اس کو فروخت کرکے بڑے بڑے منافع حاصل کرتے تھے۔ اس وقت امریکہ سے تجارتی فائدے قائم نہیں ہوئے تھے۔ یورپی تاجروں کے لئے اس وقت امریکہ کی دریافت صرف ایک بے فائدہ دریافت کے ہم معنی تھی۔

کولمبس کے بعد واسکوڈی گاما بھی انڈیا کا بحری راستہ تلاش کرنے کے لئے نکلا۔ اس کا جہاز ۲۰ مئی ۱۴۹۸ کو کالی کٹ کے ساحل پر پہنچ گیا۔ اس نے ہندستان کا سمندری راستہ دریافت کرلیا۔ اس کے بعد یورپ میں واسکوڈی گاما کو تو ہیرو کا مقام حاصل ہوگیا۔ اور کولمبس کے متعلق یہ تصور ہوگیا کہ وہ ایک بےوقوف آدمی ہے۔ برسوں کی محنت کے بعد بھی وہ حقیقی معنوں میں کوئی نفع بخش چیز حاصل نہ کرسکا۔

ایک اخبار میں کولمبس کے تذکرہ کے تحت لکھا تھا کہ اس کی موت کو کسی نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ سولھویں صدی کے وسط تک بھی اس کی دریافت کی اہمیت سمجھی نہ جاسکی۔ یہاں تک کہ

وہ وقت آیا جب میکسیکو، پیرو اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد جہاز سونا اور چاندی لے کر اسپین آنے لگے:

His death went unnoticed. Not until the middle of the 16th century was the importance of his discoveries realised. With the conquest of Mexico, Peru and other areas, fleets of gold and silver started arriving in Spain.

تاریخ کا یہ صفحہ مجھے اس وقت یاد آیا جب میں نے دیکھا کہ آج یورپ میں ساری اہمیت امریکہ کے لئے ہے۔ جدید یورپ میں انڈیا کو کسی بھی اعتبار سے کوئی مقام حاصل نہیں۔

لندن کا روزنامہ دی سنڈے ٹیلی گراف (۲۷ ستمبر ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۱۱ پر ایک مضمون تھا۔ اس کا لکھنے والا راجر کوپر (Roger Cooper) تھا جو پانچ سال سے زیادہ مدت تک ایران کی قید میں رہ چکا ہے۔ اس نے برائن کینان کی کتاب کا تعارف کرایا تھا۔ کینان ایک آئرش ہے۔ وہ بھی لبنان کے ایران نواز مسلمانوں کی قید میں رہا ہے۔ اور اس سے رہائی کے بعد اپنی یادداشت لکھ کر شائع کی ہے:

Brian Keenan, An Evil Cradling, Hutchinson.

کینان پیشہ کے اعتبار سے ہیٹنگ انجنیئر ہے۔ بیروت میں اس کو آفس کے راستہ سے اغوا کر لیا گیا۔ اس کے بعد وہ، کتاب کے مطابق، مسلم کیپٹرس کے ہاتھوں انسانی درندگی (man's brutality) کا تجربہ کرتا رہا۔ اس مضمون کا عنوان تھا —— جہنم کی طرف سفر اور اس سے واپسی:

A journey to hell and back again

میں نے اس کو پڑھ کر کہا کہ یہ نام نہاد اسلام پسند اگر اس قسم کے مسلمان ہوتے جیسا کہ دور نبوت میں مدینہ کے مسلمان تھے تو قیدیوں کا بیان اس کے برعکس ہوتا۔ ایسی حالت میں یہ قیدی وہاں سے واپس آنے کے بعد کہتے کہ ہم تو ان کے یہاں گویا جنت میں تھے، اب ہم اپنے ملک میں واپس آئے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔

۲۸ ستمبر کو ظہر کی نماز قاہرہ کی مسجد ابی بکر الصدیق (شارع عبد العزیز فہمی) میں پڑھی

اس پر تعمیر کا سن ۱۹۵۷ لکھا ہوا تھا۔ مسجد کشادہ تھی۔ مسجد سے متصل ایک کمرہ تھا جس میں امام کا دفتر تھا۔ اس میں میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز کے اوپر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ نمازیوں کی اکثریت کے سر پر ٹوپی نہ تھی۔ امام نے نماز ختم کی تو اجتماعی دعا کے بغیر اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اس قسم کی چیزیں ہندستان میں اجنبی سمجھی جائیں گی۔ مگر عرب دنیا میں اس قسم کی چیزیں عام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہی جھگڑے صرف برصغیر ہند میں پائے جاتے ہیں۔ عالم عرب میں اس قسم کے جھگڑوں کا کوئی وجود نہیں۔

اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کچھ عرب حضرات سے میں نے کہا کہ عبادت میں کچھ ارکان ہیں اور کچھ آداب۔ ارکان میں کوئی اختلاف نہیں۔ مگر آداب کے بارہ میں صحابہ کی روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جب احادیث جمع کی گئیں اور یہ اختلافات سامنے آئے تو محدثین نے ان کو توسع پر محمول کیا اور کہا کہ اِس پر عمل کر لو تب بھی ٹھیک ہے، اور اُس پر عمل کر لو تب بھی ٹھیک ہے۔ مگر فقہاء نے کہا کہ الحق لا یتعدد (حق کئی نہیں ہو سکتا) اس وقت عالم اسلام، بڑی تقسیم میں دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ عرب ملکوں میں محدثین کا نقطۂ نظر مقبول ہوا۔ اور برصغیر ہند میں فقہاء کا نقطۂ نظر پھیلا۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں محدثین کا نقطۂ نظر ہی درست ہے۔ اور اگر عرب دنیا کی طرح برصغیر میں بھی محدثین کا نقطۂ نظر آجائے تو تمام غیر ضروری جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

قاہرہ میں عربوں کی ایک مجلس تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ قرآن لغتِ عرب میں اترا۔ اور حدیث کی زبان عربی ہے۔ میں نے کہا کہ اکثر علماء اس قسم کی باتیں کہتے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ قرآن لغتِ انسان میں اترا۔ لغتِ انسان میں لغتِ عرب شامل ہے۔ مگر لغتِ عرب میں لغتِ انسان شامل نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ لغت عرب لغت الفاظ ہے اور لغت انسان لغت معانی۔ مثلاً آپ حدیث میں پڑھتے ہیں: من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ۔ لغت عرب کا تصور ذہن میں ہو تو یہاں آپ قول کو تلفظ کے معنی میں لے لیں گے۔ کیوں کہ قال کا مطلب یہی ہے۔ لیکن اگر لغت انسان کا تصور ذہن میں ہو تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ آدمی جب اللہ کے الٰہ واحد

ہونے کی حقیقت دریافت کرلے اور اس کا اظہار اپنی زبان سے کرے تو وہ ایک زلزلہ خیز تجربہ کا لسانی اظہار ہوتا ہے نہ کہ محض کچھ حروف کا تلفظ۔

اسی طرح بخاری کے آخر میں جب آپ پڑھیں گے کہ کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان تو اس کو لغت عرب میں سمجھنے کی صورت میں آپ اس کو لفظی ورد کے طور پر لے لیں گے۔ مگر جب آپ اس کو لغت انسان کے طور پر لیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ اللہ کی عظمت و قدوسیت کا ادراک ایسی چیز ہے جو روح انسانی میں ہلچل پیدا کر دینے والا ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ کلمہ سادہ طور پر صرف تلفظ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ ایک روحانی انقلاب کا لفظوں میں ڈھل جانا ہے۔

قاہرہ کے قیام میں یہاں کی کوئی چیز دیکھنے کے لئے نہ جا سکا۔ سارا وقت عربوں کے ساتھ گفت گو اور سوال وجواب میں گزرا۔ ایک عرب نوجوان جو الرسالہ مشن سے گہرے طور پر متاثر ہیں انھوں نے کہا کہ الرسالہ مشن سے واقفیت سے پہلے ہمارے ذہنوں پر سازش کے انداز میں سوچنے کا طرز فکر چھایا ہوا تھا (کانت تسیطر علینا فکرۃ المؤامرۃ) مگر اب ہم خدا کے فضل سے اس فکری مصیبت سے نکل چکے ہیں۔ اب ہم دعوتی انداز میں سوچتے ہیں۔ اب ہم کو دنیا امکانات اور فرص سے بھری ہوئی نظر آتی ہے، جب کہ اس سے پہلے یہ دنیا سازشوں اور مشکلات سے بھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

عربوں کی ایک مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کل کچھ حضرات کی پسندیدہ تعبیر یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم اسلام کو مکمل طور پر اختیار کریں۔ یجب علینا ان ناخذ الاسلام ککل) مگر یہ طریقہ سنت رسول سے ثابت نہیں۔ حضرت عائشہ رض کہتی ہیں کہ: ماخیّر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الّا اختار ایسرھما۔ اس روایت کے مطابق، اعسر کو چھوڑنا اور ایسر کو لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ مگر ان لوگوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو امر میں سے ایک کو لیتے تھے اور یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں بیک وقت دونوں کو لینا چاہئے (فکان الرسول یاخذ احد الامرین وھم یقولون علینا ان نأخذ کلا الامرین)

قاہرہ میں عرب نوجوانوں کا ایک بڑا حلقہ بن گیا ہے جو الرسالہ کے مشن سے گہری شیفتگی رکھتا ہے اور اس کے لئے عملاً کوشاں ہے۔ ان کی مختلف سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے الرسالة للاعلام الدولی (مدینة نصر، قاهرة) کے نام سے ادارہ قائم کیا ہے۔ وہ مستقل طور پر الرسالہ مطبوعات کو عربی میں منتقل کرنے اور اس کو چھاپنے کا انتظام کر رہا ہے۔

(ٹیلی فون: ۲۶۲۳۱۰۵، ۲۶۲۸۴۹۹، ۲۶۲۲۴۰)

انھوں نے دین کامل کو الدین الکامل کے نام سے ۴۰۰ صفحات پر شائع کیا ہے۔ اسی طرح وہ تقریباً ۲۰ کتابیں چھپوا چکے ہیں اور کئی کتابیں اس وقت زیر تیاری ہیں۔ پمفلٹ کی صورت میں وہ مستقل کتابچے تیار کر کے چھاپ رہے ہیں جن کی تعداد پندرہ تک پہنچ چکی ہے۔

قاہرہ کے ایک ادارہ دار الصحوة للنشر والتوزیع (ٹیلی فون: ۳۷۴۰۰۱۷، ۹۸۷۹۲۴) نے اسلامی مرکز کی مختلف کتابوں کے عربی ترجمے شائع کئے ہیں۔ ۱۹۹۲ میں انھوں نے "خلیج ڈائری" کا عربی ترجمہ (مع اضافہ) شائع کیا ہے جو ۱۲۸ صفحہ پر مشتمل ہے۔ اس کا نام یومیات حرب الخلیج ہے۔ اور اس کا سب ٹائٹل ہے: لیس التاریخ مجرد قصة لاحداث مضت. بل التاریخ سجل حافل بالعبر والدروس للحاضر والمستقبل۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے اس حدیث کا تذکرہ کیا کہ من جرّ ازارہ خیلاء... میں نے اس کے جواب میں کہا کہ اس حدیث میں کلیدی لفظ خیلاء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل بری چیز کبر ہے۔ اگر آپ اپنی ازار اوپر باندھیں مگر دوسری چیزوں کی بنیاد پر کبر کی نفسیات آپ کے اندر پائی جائے تو گویا کہ ظاہری صورت نہ ہونے کے باوجود اصل حقیقت آپ کے اندر موجود ہے۔ اس پر حاضرین میں سے ایک عرب نے کہا کہ آج اگر اس بات کو کہنا ہو تو شاید اس طرح کہنا زیادہ بامعنی ہوگا کہ: من اشترى سيارة مرسيدس خيلاء فهو...

۲۹ ستمبر کو عصر کی نماز قاہرہ کی مسجد الامین (شارع اسماعیل صبری پاشا) میں پڑھی۔ یہ ایک چھوٹی مگر صاف ستھری مسجد تھی۔ اس کے ایک گوشہ کو منبر کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ مسجد کے اندر دو الماری میں مجلد عربی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، علم العقائد وغیرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔

وقت ہوا تو امام مصلے پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اقامت کہی، اس کے بعد خود ہی نماز پڑھائی۔ نمازیوں کی تعداد ایک صف سے زیادہ نہ تھی۔ نماز پوری کرنے کے بعد امام نے اپنے دائیں طرف چہرہ کرکے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا اور بائیں طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس کے بعد اجتماعی دعا کے بغیر لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

برصغیر ہند میں فقہی اختلاف نے ملت کو مختلف طبقوں میں بانٹ رکھا ہے۔ عالم عرب میں یہ چیز یں موجود نہیں۔ البتہ ایک اور چیز مزید شدت کے ساتھ موجود ہے، اور وہ سیاسی اختلاف ہے۔

ڈاکٹر عبد الحلیم عویس نے کچھ مسلم لیڈروں کا ذکر کیا جنھوں اپنے غلط عمل کے ذریعہ ملت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ مگر مسلمانوں کے درمیان اب بھی ان کو بڑائی کا مقام حاصل ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہیں جو اپنے مفسدین کو عظمت کا درجہ دیتے ہیں (امۃ تُعَظِّمُ مفسدیها)

میں نے کہا کہ یہ غالباً پریس اور ریڈیو اور ٹیلیویژن کے دور کا ظاہرہ ہے۔ اس قسم کے رہنما بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں۔ وہ مظاہراتی قسم کے اقدامات کرتے ہیں۔ اس بنا پر وہ نیوز میڈیا اور الکٹرانک میڈیا میں نمایاں کئے جاتے ہیں۔ اس طرح انھیں اپنی غلط فکری یا غلط کاری کے باوجود شہرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور جن لوگوں کو ایک بار شہرت حاصل ہو جائے وہ لوگوں کے درمیان ہمیشہ عظمت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

یہاں اخوانی فکر کے ایک عرب عالم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس زمانہ کا سب سے بڑا فتنہ فصل الدین عن الدولۃ کا مغربی نظریہ ہے۔ یہ دشمنان اسلام کی سازش ہے۔ اس طرح وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو بالکل بے جان کرکے چھوڑ دیں۔ اور دین کی پشت پر سیاسی طاقت کا زور باقی نہ رہے۔ میں ان کی تقریر سنتا رہا۔ پھر میں نے کہا: الفصل بين الدين والدولة كعقيدة، فلا۔ اما الفصل بين الدين والدولة كمنهج فنعم۔

میں نے کہا کہ قرآن وسنت میں بلاشبہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق احکام ہیں۔ لیکن اگر دعوت اسلامی کا مطلب یہ ہو کہ اول روز سے پورے دین کو ایک مکمل ریاستی نظام کی حیثیت سے قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے تو یہ ایک ایسی تکلیف ہے جس کا مکلف انبیاء کو بھی (بشمول پیغمبر

اسلام) نہیں کیا گیا۔ پھر ہم کو اس کا مکلف کیونکر بنایا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ فہرست احکام کے اعتبار سے مکلف نہیں ہوتا بلکہ اپنی وسع کے اعتبار سے مکلف ہوتا ہے۔ (لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا)

الاہرام قاہرہ کا مشہور اخبار ہے۔ یہ نام ان قدیم عمارتوں کے نام پر ہے جن کو اہرام مصر کہا جاتا ہے اور جو سیاحوں کی خصوصی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ نجیب حداد نے لکھا ہے کہ مصر میں دو اہرام ہیں۔ ایک وہ جس کو دیکھنے کے لئے لوگ چل کر اس کے پاس آتے ہیں۔ دوسرا اہرام وہ چل کر دوسروں کے پاس جاتا ہے۔

الاہرام کا شمارہ ۲۷ ستمبر ۱۹۹۲ دیکھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک خبر کا عنوان تھا: احجار الاھرامات وابی الھول، ھل جاءت من الکوکب الاحمر (اہرام اور ابوالہول کے پتھر کیا مریخ سے لائے گئے تھے) امریکہ کے ادارہ ناسا نے مصنوعی سیاروں کے ذریعہ مریخ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کی بنیاد پر قیاس کر کے یہ خبر بنائی گئی تھی۔ مگر اس قسم کی خبریں محض تفنن کے لئے ہوتی ہیں۔ خالص علمی اعتبار سے ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

روزنامہ الاخبار (۲۸ ستمبر) میں ایران کے بارہ میں ایک مضمون تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ایران کا کہنا ہے کہ جزیرہ ابوموسیٰ کے مسئلہ کا حل صرف فوجی طاقت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو شکایت نہیں ہونا چاہئے اگر عرب بھی تسلیح کا طریقہ اختیار کریں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو مغربی ممالک بیک وقت دونوں کی مدد کریں گے۔ کیوں کہ یہ ثابت ہو چکا ہے شیطان اکبر عراق اور ایران دونوں کو ان کی اس جنگ کے دوران مسلح کر رہا تھا جس کو انور سادات نے احمقانہ جنگ قرار دیا تھا (فقد ثبت ان الشیطان الاکبر کان یسلح العراق وایران معاً خلال حربھما الغبیۃ کما وصفھا السادات)

دکتور عبدالحلیم عویس نے گفتگو کے دوران کہا کہ مصر کا شاہی دور (العصر الملکی) موجودہ دور کے مقابلہ میں بہت اچھا تھا۔ اس زمانہ کے حالات میں مصر میں بڑے بڑے اہل علم اور اہل ادب اٹھے۔ اس زمانہ میں مصر علمی اور مادی ترقی پر تھا۔ حتی کہ اسلامی ترقی بھی اس وقت آج سے زیادہ تھی۔ آج مصر ہر لحاظ سے پہلے کے مقابلہ میں کم نظر آتا ہے۔

مگر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصر کے شاہی دور کو کس نے ختم کیا۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ شاہی دور اس طرح ختم ہوا کہ حسن البنا نے اپنی پرجوش تقریروں کے ذریعہ لوگوں کو اس کے خلاف اکسایا۔ اس کے بعد اسی بنیاد پر جوشیلے نوجوانوں کی ایک جماعت بنی۔ اس حلقہ نے فوجی افسروں کے ساتھ مل کر مصر کے شاہ فاروق کے خلاف وہ منصوبہ بنایا جس کو آجکل کی زبان میں سازش کہا جاتا ہے۔ اس طرح الاخوان المسلمون اور فوجی افسروں نے مشترکہ کوشش سے شاہ فاروق کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اس کو اور اس کے خاندان کو مصر سے باہر نکال دیا۔

اس کے بعد مصر میں سخت ناگفتہ بہ حالات پیدا ہو گئے۔ اگر اخوانی لیڈر اس کو جانتے تھے تو ان کی سنجیدگی مشتبہ ہوتی ہے، اور اگر وہ اس کو نہیں جانتے تھے تو ان کی قائدانہ صلاحیت مشتبہ ہوتی ہے۔ اب یہ اخوان کے معتقدین کے اوپر ہے کہ وہ دونوں میں سے کس توجیہہ کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔

شیخ محمد عبدہ (۱۹۰۵ - ۱۸۴۹) مصر کے مشہور عالم اور مصلح تھے۔ ڈاکٹر عبدالحلیم عویس نے ان کے تذکرہ کے ذیل میں بتایا کہ محمد عبدہ نے ابتداءً سید جمال الدین افغانی کے ساتھ سیاسی کام کیا۔ مگر آخر میں وہ اس سے مایوس ہو گئے۔ اس وقت انھوں نے سیاسی کام سے سخت نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اللہ کی لعنت ہو سیاست پر اور سیاست دانوں پر اور ہر اس چیز پر جو سیاست کے لفظ سے تعلق رکھتا ہو (قال محمد عبدہ بعد ان یئس من العمل السیاسی مع جمال الدین الافغانی: لعن اللہ السیاسۃ والساسۃ وکل ما یتصل بکلمۃ ساس یسوس)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ایسا ہوا کہ مصر کے ایک بڑے عالم نے جس سیاست پر اس طرح لعنت بھیجی تھی، اسی سیاست کو دوبارہ مصری نوجوانوں نے مزید شدت کے ساتھ اختیار کر لیا اور وہ جماعت وجود میں آئی جس کو الاخوان المسلمون (قائم شدہ ۱۹۲۸) کہا جاتا ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ مفتی محمد عبدہ کا اظہار لعنت مصری نوجوانوں کو اس ہلاکت خیز سیاست سے روکنے میں کامیاب کیوں نہ ہوا۔

اس کی کم از کم ایک خاص وجہ یہ ہے کہ مفتی محمد عبدہ نے لعنت کی زبان میں تو اس کے خلاف اظہار خیال کیا، مگر وہ دلیل کی زبان میں اس کو لوگوں کے سامنے ثابت نہ کر سکے۔ انسان کے

یک عمل سے دوسرے عمل کی طرف پھرنے کے لئے ضروری ہے کہ سابقہ عمل کا غلط ہونا اور دوسرے عمل کا صحیح ہونا دلائل سے ثابت شدہ بنا دیا جائے۔ مگر مفتی محمد عبدہ کی بعد کی تحریروں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے یہ کام انجام دیا۔ رشید رضا کی کتاب تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ بھی اس سلسلہ میں کوئی واقعی مواد پیش نہیں کرتی۔

۲۹ ستمبر کو قاہرہ میں ایک عرب نوجوان عبد السلام احمد حدود (۳۲ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ تقریباً چار سال (۱۹۹۲ - ۱۹۸۸) الجزائر میں رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے وہاں عمل کی پوری آزادی تھی۔ مسجد کے اندر بھی اور مسجد کے باہر بھی۔ یہ ایک "فرصة عظيمة" تھی جو کسی اور عرب ملک میں موجود نہیں۔ مگر افسوس کہ ہمارے الجزائری بھائی ان مواقع کو دعوت اور اشاعت اسلام کے لئے استعمال نہ کر سکے۔ بلکہ اس آزادی کو حکام کے خلاف سیاسی تحریک چلانے میں استعمال کیا۔ اس کی وجہ سے الجزائر میں مشکلات پیدا ہو گئیں۔

میں نے کہا کہ مسلم اخبارات میں کثرت سے میں نے الجزائر کے بارہ میں پڑھا ہے۔ مگر تمام مسلم اخبارات صرف کہانی کا نصف ثانی بتلاتے ہیں، وہ کہانی کا نصف اول اپنے قارئین کو نہیں بتاتے۔ یہ قرآن کے الفاظ میں تطفیف ہے۔ ان پر لازم تھا کہ وہ اس طرح لکھیں کہ الجزائر میں دینی عمل کی آزادی تھی۔ مگر ہم نے حکمرانوں سے سیاسی نزاع کی، اس کے بعد آزادی باقی نہ رہی۔ (لقد قرأت كثيرا عن الجزائر في جرائد المسلمين۔ ولكن كلهم يكتبون عن النصف الثاني. وهم لا يكتبون عن النصف الاول۔ فكان عليهم ان يكتبوا انه كان في الجزائر حرية دينية۔ ولكن عندما قاموا للسياسة جاءت هذه الصعوبات)

۲۹ ستمبر کی شام کو دکتور عبد الحلیم عویس سے ملاقات ہوئی۔ وہ ریاض کی جامعۃ الامام میں علوم اجتماعی کے پروفیسر ہیں۔ ان کے ساتھ قاہرہ الجدیدہ سے حلوان کی طرف روانگی ہوئی۔ یہ ایک لمبا راستہ تھا۔ قاہرہ کا بڑا حصہ سفر کے دوران آنکھوں کے سامنے گزرتا رہا۔

ایک مقام پر نیل کے کنارے ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پر عصفور الجنۃ لکھا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اس کا تلفظ عصفور الگنۃ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے سفر ہندستان کے تحت بنارس کا ذکر کیا تو انھوں نے ایک جملہ میں منفر جنجا کا لفظ استعمال کیا۔

ابتداءً یہ لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کی مراد اس سے دریائے گنگا ہے۔ مصر کے لوگ ج کو گ پڑھتے ہیں۔ مگر غیر عربی الفاظ بولنا ہو تو اس وقت وہ گ کو ج کی مانند پڑھیں گے۔

مصر میں بڑے شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ ج کو گ بولنے لگے ہیں۔ مگر شہروں کے باہر دیہات کے لوگ اب بھی ج کو ج ہی بولتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص ج کو ج کی آواز سے بولے اس کو تعلیم یافتہ لوگ قروی (دیہاتی) کہتے ہیں۔

۲۹ ستمبر کی شام کو میں دکتور عبد الحلیم عویس کے مکان پر تھا۔ میری موجودگی کی اطلاع پا کر وہاں الاستاذ محمود محمد خلیل آ گئے۔ ان کا تعلق ریڈیو قاہرہ سے ہے۔ انھوں نے ریڈیو کے لئے ایک مفصل انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق کچھ الرسالہ مشن سے تھا۔ اور کچھ موجودہ زمانہ میں امت مسلمہ کے مسائل سے۔

ایک سوال "اولویات العمل الاسلامی" سے متعلق تھا۔ یعنی اعمال اسلامی کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں ہماری ترجیح کیا ہونی چاہئے۔ میں نے کہا کہ اس کا واضح جواب صحیح بخاری کی روایت میں موجود ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما۔ ترجیح کے سلسلہ میں ہمارا طریقہ اختیار الیسر کا ہونا چاہئے۔ یہاں الیسر سے مراد وہ چیز ہے جو ممکن ہو۔ مصر میں اسلام پسند حضرات کے لئے عمل کے دو میدان تھے۔ ایک، تعلیم و دعوت۔ دوسرا، انقلاب حکومت۔ پہلا ممکن تھا۔ اور دوسرا غیر ممکن۔ اس لئے سنت رسول کے مطابق، ان کے لئے صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ انقلاب حکومت کے میدان میں نہ اتریں۔ اور تعلیم و دعوت کے میدان میں کام کریں۔

شام کی اس مجلس میں حکومت مصر کے ایک قانونی مستشار محروس فودہ موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ اخوانی نوجوانوں کے اندر جذبہ تھا مگر ان کے اندر شعور نہ تھا (کانوا متحمسین ولکن غیر واعین)۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اخوانی نوجوانوں سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ تمہارے لئے دعوت کا میدان کھلا ہوا ہے، اس میں کام کرو۔ تم پہلے گہرے مطالعہ کے لئے دین اور دنیا کا علم حاصل کرو۔ اور پھر سیاسی مشاکل سے صرف نظر کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے غیر

یاسی میدان کے مواقع کو استعمال کرو۔ مگر اخوانی نوجوانوں نے اس نصیحت کو قبول نہیں کیا۔

یہ سن کر دکتور عبد الحلیم عویس نے کہا: انھم لا یریدون ان یعملوا فی المیدان الصعب وذھبوا الی میدان سھل (وہ مشکل میدان میں عمل کرنا نہیں چاہتے اس لئے انھوں نے آسان میدان کو اختیار کر لیا) یعنی دعوت کے میدان میں عمل کرنے کے لئے صبر کی صبر کی ضرورت ہے اور صبر انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز ہے۔

ایک عرب نوجوان مختار احمد الشیبانی سے ملاقات ہوئی تو وہ دیر تک مجھ سے لپٹ کر روتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا کہ یا تو پاگل ہو جاؤں یا خودکشی کر لوں۔ مگر الرسالہ مشن نے عین وقت پر مجھ کو بچا لیا۔ انھوں نے کہا کہ اس مشن سے واقف ہونے سے پہلے میں ایک شعوری قیدخانہ میں جی رہا تھا۔ اس مشن سے واقف ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا گویا کہ میں کرۂ زمین کا بوجھ اپنے اوپر لادے ہوئے تھا۔ اب یہ بوجھ میرے اوپر سے اتر گیا۔ قبل التعرف علی الرسالۃ کنت اعیش فی سجنٍ شعوریّ۔ اما بعد التعرف علی الرسالۃ فاحسست کانی کنت احمل الکرۃ الارضیۃ ثم وقعتُ من علی کاھلی۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ پچھلے تقریباً ۵۰ سال سے عالم عرب کے نوجوان اور سوچنے والے لوگ ایک شدید فتنہ میں مبتلا تھے۔ یہ اسلام کی سیاسی اور نظامی تعبیر کا فتنہ تھا۔ یہ فکر حسن البنا اور سید قطب کی تحریروں کے ذریعہ عرب ملکوں میں پھیلا۔ پھر سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں کے عربی ترجموں سے اس میں مزید اضافہ ہوا۔

اس انقلابی فکر سے متاثر افراد کے لئے دو میں سے ایک کا اختیار باقی رہ گیا تھا یا حکومتی تشدد کا نشانہ بننا یا نفاق کا طریقہ اختیار کرنا۔ سنجیدہ افراد اس صورت حال سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ وہ سخت قسم کے ذہنی اضطراب میں مبتلا تھے۔ اب الرسالہ مشن ایسے لوگوں کو حیات نو کا پیغام دکھائی دے رہا ہے۔

عربوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ شرحوں اور تفسیروں کی ایک کمی یہ ہے کہ ان میں آیات و احادیث کو فروع پر تو منطبق کیا جاتا ہے، مگر اساسات پر منطبق نہیں کیا جاتا۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ لتتبعن سنن من کان قبلکم شبراً بشبر وذراعاً بذراع حتی

لو دخلوا جحر ضب دخلتموه۔ اس حدیث کی تشریح کو تعویذ اور عملیات جیسے اعمال پر تو چسپاں کیا جاتا ہے۔ مگر ان کو زیادہ اہم امور پر چسپاں نہیں کیا جاتا۔

مثلاً قدیم زمانہ میں دوسری قوموں نے یہود کے اوپر سخت معاملہ کیا۔ یہود اگر ان سختیوں کو خدائی تنبیہ سمجھتے تو ان کے اندر تضرع اور رجوع کی کیفیت پیدا ہوتی۔ مگر انھوں نے ان تشددانہ واقعات کو دوسری قوموں کی عداوت اور مخالفانہ سازش قرار دیا۔ اس کے نتیجہ میں ان کی قساوت اور تمرد میں اضافہ ہو گیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ جو کچھ کر رہا ہے وہ اسی سنت یہود کا اتباع ہے، غیر مسلم قوموں کی طرف سے پیش آنے والے شدائد کو وہ اسلام دشمنوں کی سازش قرار دینے میں مصروف ہیں۔ اگر وہ ان شدائد کو تنبیہ خداوندی سمجھتے تو ان کے اندر انابت اور رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی لیکن جب انھوں نے اس کو مؤامرہ (سازش) بتایا تو اس سے انھیں قساوت اور سرکشی کے سوا کوئی اور غذا حاصل نہ ہو سکی۔

۳۰ ستمبر کی شام کو قاہرہ سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ لمبے سفر کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے آج میں آخری منزل طرف جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ اسی طرح ہر آدمی اپنے دنیوی مراحل حیات کو طے کرکے آخرت کی طرف روانہ ہوتا ہے جہاں وہ اپنے ابدی مقام کا تجربہ کرسکے۔ یہ احساسات دعا کی صورت میں ڈھلنا چاہتے تھے مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھے دعا کے لئے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

مجھے اپنے بھائی کا قصہ یاد آیا۔ وہ ایک ہندو کالج میں بی ایس سی کے داخلہ کے لئے گئے۔ مگر وہ دو مہینہ لیٹ ہو چکے تھے۔ پرنسپل نے کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ داخلہ دو مہینے پہلے بند ہو چکا ہے۔ مگر مزید سوال وجواب کے بعد وہ ان کے لئے ہمدرد بن گیا۔ اس نے فارم منگوایا اور کہا کہ اس کو پر کرو۔ پھر اس کو محسوس ہوا کہ بیک ڈیٹ میں فارم بھرنا شاید ان کے لئے مشکل ہوگا، اس لئے فارم ان کے ہاتھ سے لے کر پرنسپل نے خود اس کو پر کیا اور ان کو داخلہ دے دیا۔

میں نے کہا کہ خدایا، میں آپ کا وہ عاجز بندہ ہوں جس کے پاس دعا کے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ آپ خود ہی میری طرف سے دعا کے الفاظ متعین کرکے اس کی قبولیت کا فیصلہ فرما دیجئے۔

قاہرہ ایرپورٹ میں داخل ہوا تو وہاں ایک نئی چیز نظر آئی۔ ایک شیشہ کا کیس تھا۔ اس میں بہت سے نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ قریب سے دیکھا تو لکھا ہوا تھا: بعض النقود لحماية البيئة یعنی ماحول (environment) کو بچانے کے لئے یہاں کچھ رقم ڈالیں۔ ہزار سال پہلے اگر اس قسم کا کیس رکھا جاتا تو کوئی شخص اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کیوں کہ ماحول کی حفاظت کا مسئلہ صنعتی تہذیب نے پیدا کیا ہے۔ اور صنعتی تہذیب کی عمر چند سو سال سے زیادہ نہیں۔ اور ماحول کی کثافت کا مسئلہ تو موجودہ شدت کے ساتھ صرف بیسویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوا ہے۔

قاہرہ سے عرب امارات کی فلائٹ ۲۰۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں اس کی فلائٹ میگزین الامارات (Emirates) کا شمارہ ستمبر ۱۹۹۲ دیکھا۔ ایک مضمون میں مارٹن سلیمان (Martin Seligman) کی کتاب التفاؤل المکتسب (Learned Optimism) کا تعارف تھا۔ اس کتاب میں تحقیق کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ مایوس کن حالات میں بھی ہمیشہ روشن امکان کا ایک پہلو موجود ہوتا ہے۔ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو روشن پہلو پر اپنی ساری توجہ لگا دیتے ہیں۔ جب آپ کسی چیز کے ممکن ہونے پر یقین کر لیتے ہیں تو آپ کی عقل اس کے حصول کے لئے متحرک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ کا دماغ اپنے آپ اس کے عملی وسائل دریافت کر لیتا ہے (فالايمان بامكانية عمل شئ مايحرك العقل للعمل من اجل انجازه وعندما تؤمن لشيئ يستنبط دماغك وسائل تنفيذه)

جہاز میں صفائی اور باقاعدگی کا معیار نہایت عمدہ تھا۔ اس میں ایک نئی چیز یہ نظر آئی کہ جہاز کے اندر ویڈیو اسکرین پر قبلہ کا رخ بتانے کا انتظام تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اسکرین پر بار بار ایک جہاز کی تصویر آجاتی تھی۔ اس تصویری جہاز کا رخ عین وہی ہوتا تھا جو ہمارے واقعی جہاز کا تھا۔ اس کے بعد اس تصویری جہاز کے کنارے تیر کا ایک نشانہ ظاہر ہو جاتا تھا۔ یہ تیر بتاتا رہتا تھا کہ اب قبلہ کا رخ کس طرف ہے۔ جب ہوائی جہاز کی صنعت شروع ہوئی تو کچھ لوگوں نے بطور طنز کہا کہ یہ نمازی لوگ اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کے اندر اپنے قبلہ کا رخ کس طرح معلوم کریں گے۔ مگر اللہ کی نشانی نے ظاہر ہو کر بتایا کہ اللہ اس سے عاجز نہیں کہ وہ آسمانی فضاؤں

میں بھی اپنے بندوں کو اپنی عبادت کی سمت سے آگاہ کر دے۔

ساڑھے چار گھنٹہ کی پرواز کے بعد جہاز دوبئی میں اترا۔ یہاں چار گھنٹہ کے انتظار کے بعد دہلی کے لئے جہاز لینا تھا۔ دوبئی کا ہوائی اڈہ اور یہاں کی ہر چیز انٹرنیشنل معیار کے مطابق نظر آئی۔ البتہ یورپ کے ملکوں کے ہوائی اڈوں پر انسانوں کی بھیڑ بہت کم ہوتی ہے، جب کہ دبئی کے ہوائی اڈہ پر ہر طرف انسانوں کی بھیڑ نظر آئی۔ یہ ایک معروف ترین ہوائی اڈہ ہے۔ یہاں سے روزانہ تقریباً سو اسو ہوائی جہاز اڑتے ہیں اور وہ دنیا کے تقریباً ایک سو ملکوں میں اترتے ہیں۔

دبئی کے ہوائی اڈہ پر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ وہاں پہنچ کر نماز پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ مسجد کے باہر عربی میں اماکن الصلاۃ اور انگریزی میں (Prayer Room) لکھا ہوا تھا۔ مسجد اللہ کے بندوں کے لئے مامن ہے۔ اس کے اندر داخل ہو کر ایک خاص طرح کا سکون حاصل ہوتا ہے۔ مسجد نہ صرف عبادت گاہ ہے بلکہ وہ اہل ایمان کے لئے روحانی پناہ گاہ بھی ہے۔

میں نے سوچا کہ دنیا کے ہر ملک میں اور ہر شہر میں کثرت سے مساجد کی موجودگی مسلمانو کے لئے ایک غیر معمولی ایڈوانٹج کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ اسلامی تحریک کو مساجد کی بنیاد پر اٹھائیں، اور پھر دنیا کے ہر گوشہ میں اپنے لئے بنا بنایا مرکز عمل پالیں۔

دبئی سے دہلی کے لئے الامارات (Emirates) کی فلائٹ نمبر ۷۰۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے رات کو دبئی اترے۔ اس وقت کیلنڈر میں ستمبر کی ۳۰ تاریخ تھی۔ مگر یہاں چار گھنٹہ قیام کے بعد جب اگلے جہاز پر بیٹھے تو اکتوبر ۱۹۹۲ کی پہلی تاریخ آچکی تھی۔ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ مگر انسان کتنا کم اس کا اندازہ کرتا ہے۔

راستہ میں قاہرہ کا روزنامہ الاخبار (۳۰ اکتوبر ۱۹۹۲) پڑھا۔ اس کے ایک مضمون کا عنوان تھا: دعاۃ الحرب الصلیبیۃ ... ماذا یریدون۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا تھا کہ اور اب، مذہبی جنگ کے مبلغین کا نشانہ کیا ہے، جو کہ نقارہ بجا رہے ہیں اور لوگوں کو صلیبی جنگ کے نام پر جمع کر رہے ہیں (والآن۔ ما ھی اھداف دعاۃ الحرب الدینیۃ والذین یدقون الطبول الآن ویجمعون الناس حول شعار الحرب الصلیبیۃ)

دین کے نام پر جنگ کی باتیں کرنے والوں کی اس نے تین قسم بتائی تھی۔ ان میں قسم اول الاخوان المسلمون کی تھی۔

اسی کے ساتھ عرب امارات کا روزنامہ الاتحاد (۳۰ اکتوبر) پڑھا۔ یہ ۲۸ صفحات پر نکلتا ہے۔ ان اخبارات کو پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ مصر اور اس قسم کے دوسرے ملکوں کے عوام کا ایک ایڈوانٹج یہ ہے کہ ان کی زبان اور قومی صحافت کی زبان ایک ہے۔ اس لئے دونوں کے درمیان براہ راست رشتہ مسلسل قائم رہتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی سرگرمیاں بھی بآسانی ملکی صحافت میں جگہ پاتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس ہندستان میں قومی صحافت کی زبان اور مسلمانوں کی زبان الگ الگ ہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان قومی صحافت کی سطح پر ایک غیر متعلق گروہ بن گئے ہیں۔ ملک کو ان کی شخصیتوں اور ان کی سرگرمیوں کی کوئی اطلاع نہیں ہوتی اس کے کہ یہاں کی صحافت کبھی مسلمانوں کی کسی خبر کو خود اپنے مقاصد کے لئے چھاپنا پسند کرے۔

ڈھائی گھنٹہ کی پرواز کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۹۲ کو ۹ بجے ہمارا جہاز دہلی ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ لویل سفر اس طرح ختم ہوا کہ ہم جہاں سے چلے تھے، دوبارہ وہیں پہنچ گئے۔ میں نے سوچا کہ آخرت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ آدمی خدا کے پاس سے آیا ہے۔ اور دوبارہ اس کو خدا کی عدالت میں پہنچادیا جائے گا۔ یہ معاملہ واپسی کا معاملہ ہوگا نہ کہ کسی نئے مقام پر جانے کا۔

ٹامس فلر (Thomas Fuller) ایک انگریز مصنف تھا۔ وہ ۱۶۰۸ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۶۶۱ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ سفر عقل مند آدمی کو زیادہ بہتر بناتا ہے۔ اور بیوقوف آدمی کو اور زیادہ خراب کر دیتا ہے:

Travel makes a wise man better, but a fool worse.

اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعات خارج میں خواہ کچھ ہوں، آدمی ان کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔ جتنی آدمی کی نظر ہوگی اتنا ہی وہ واقعات کو دیکھ اور سمجھ پائے گا۔

سفر نامہ لکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اگر میں ایسا کروں کہ صرف ایک سطر کا سفر نامہ شائع کر دوں جس میں بس یہ لکھا ہوا ہو کہ "میں دہلی سے فلاں فلاں مقام پر گیا اور پھر دوبارہ دہلی واپس آگیا" تو پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ تو صرف ایک خبر ہے۔ اس سے ہم سفر کی بابت کیا

جان سکتے ہیں۔ مگر کئی قسط میں چھپنے والا سفرنامہ بھی اتنا ہی نامکمل ہوتا ہے جتنا مذکورہ قسم کا ایک سطر کا خبرنامہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر بات غیر مذکور ہے۔ بولے ہوئے تمام الفاظ اور لکھے ہوئے تمام مضامین اصل واقعہ کو بیان کرنے کے لئے اتنا ہی نامکمل ہیں جتنا ٹیلی فون کے پورے نظام کو بتلانے کے لئے لفظ "ٹیلی فون"۔ حقائق کی دنیا اس سے زیادہ ہے کہ الفاظ کا کوئی بھی ذخیرہ اس کو بیان کر سکے۔ اس دنیا میں آدمی صرف اپنے سوچنے کی صلاحیت سے باتوں کو جانتا ہے نہ کہ دوسروں کے لکھے یا بولے ہوئے الفاظ سے۔

مجھے ہر سفر میں کچھ ایسے تجربات ہوتے ہیں جن کو لفظوں میں لکھا جائے تو وہ لفظوں میں نہیں سماتے۔ اور اگر ان تجربات کو نہ لکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا سفرنامہ لکھا ہی نہیں گیا۔ یہ ایک اعتبار سے گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل جیسا معاملہ ہے۔ تاہم یہ ایک انسان کے احساسات ہیں، اور اصل حقیقت کا علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں۔

اظہار حقیقت کا اصل مقام آخرت ہے۔ عین ممکن ہے کہ جب آخرت آئے تو کہا ہوا بے کہا بن جائے، اور جو بے کہا ہے، وہی کہا ہوا قرار پائے۔ انسان کے لئے صرف یہی سزاوار ہے کہ وہ اپنے عجز کا اقرار کرے اور مالک حقیقی سے رحمت و مغفرت کی دعا کرتا رہے۔

منافقت کا کیس

۲۰ اگست ۱۹۹۱ کے اخبارات یہ ڈرامائی خبر لائے کہ ماسکو کی حکومت پر کٹر کمیونسٹوں نے قبضہ کرلیا اور پریسیڈنٹ میخائیل گورباچیف کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ ہندستان ٹائمس (۲۰ اگست) کے صفحہ اول کی پہلی سرخی کے الفاظ یہ تھے :

Hardliners oust Gorbachov

مگر ۴۸ گھنٹہ کے اندر تاریخ بدل گئی۔ مختلف اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ گورباچوف کو کریمیا کی قید سے رہا کر کے دوبارہ ماسکو کے صدارتی محل میں پہنچا دیا گیا۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست) کے صفحہ اول کی پہلی سُرخی یہ تھی :

Gorbachov is back

ہندستان ٹائمس (۲۵ اگست ۱۹۹۱) میں لاس اینجلیز ٹائمس کے نامہ نگار مقیم ماسکو ڈیوڈ ریمنک (David Remnick) کی رپورٹ چھپی ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ گورباچوف کے خلاف بغاوت کا خاص لیڈر کے جی بی کا چیف ولادیمیر کرایوچکوف (Vladimir Kryuchkov) تھا۔ برسوں کے دوران اس نے گورباچوف کا مکمل اعتماد کر لیا تھا۔ اور پھر وہی تھا جس نے گورباچوف کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی سازش کی قیادت کی :

> For years, he had won Gorbachev's absolute trust, and then he led the plot to overthrow him. (p. 16)

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی ذمہ دار کے خلاف جو لوگ بغاوت کرتے ہیں وہ اس کے انتہائی قریبی افراد ہوتے ہیں۔ اس کا راز منافقت ہے۔ منافق افراد مصنوعی طور پر وفاداری ظاہر کر کے قریب ہو جاتے ہیں۔ پہلے وہ وفاداری دکھا کر جگہ حاصل کرتے ہیں۔ پھر جب دیکھتے ہیں کہ اب بغاوت کرنے میں فائدہ ہے تو بغاوت کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی مرحلہ میں ان کا کیس موقع پرستی کا کیس ہوتا ہے اور آخری مرحلہ میں ان کا کیس سرکشی کا کیس۔ منافقین کی یہ قسم تاریخ کے ہر دور میں پائی گئی ہے اور آج بھی پائی جاتی ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۱۰۰

۱ نیورلڈ موومنٹ (New World Movement) کا ایک اجتماع ۵ا جون کو نئی دہلی رہیلی روڈ، پر ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اس کے چیر مین شری اوم پورنا سو تنترا ہیں۔ صدر اسلامی مرکز نے اپنی تقریر میں موضوع کی بابت اپنے خیالات پیش کئے۔

۲ ہندی پندرہ روزہ ایا میگزین کے نمائندہ مسٹر شاہد چودھری نے ۱۶ جون ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اصلاح کی ضرورت مسلمانوں کے لئے ہے نہ کہ قرآن کے لئے۔ انڈیا میں اگر پولٹیکل لیڈروں میں کرپشن ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ڈیموکریسی میں اصلاح کی ضرورت ہے بلکہ یہاں کے پولٹیکل لیڈروں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

۳ انگریزی اخبار سنڈے آبزرور کے نمائندہ مسٹر راجیو سکسینہ نے ۱۶ جون ۱۹۹۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ کیا اسلام ایک غیر روادار (intolerant) مذہب ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں کچھ نام نہاد اسلام پسندوں نے ضرور غیر رواداری بلکہ تشدد کا انداز اختیار کیا ہے۔ مگر اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کامل طور پر ایک امن پسند مذہب ہے اور وہ سماج میں رواداری کو فروغ دینا چاہتا ہے۔

۴ ہندی ہفت روزہ نئی زمین کی نمائندہ شاداں نیازی نے ۱۷ جون ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ٹیلیفون پر لیا۔ سوالات کا تعلق خاندان میں عورت کا درجہ و مقام سے تھا۔ اس سلسلہ میں سورۂ نسا کی آیت ۳۴ کی وضاحت کی گئی۔

۵ پچاس صفحہ کی ایک کتاب خاتون جنت کے نام سے تیار ہوئی ہے۔ اس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی خاتون کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ انشاء اللہ اس کو الرسالہ میں خاتون نمبر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔

۶ انگریزی اخبار سنڈے میل کی نمائندہ مسز سرجنا شرما نے ۲۱ جون ۱۹۹۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی

مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ قرآن کے ٹکسٹ میں اگر کوئی شخص تبدیلی کی بات کرتا ہے تو وہ ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر کوئی شخص قرآن کے کسی انٹرپٹیشن کو دوبارہ قابل غور بتاتا ہے تو اس میں کوئی ہرج کی بات نہیں۔

۷ اندرا گاندھی فاؤنڈیشن کی طرف سے شملہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ایک کانفرنس ۵-۶ جولائی ۱۹۹۴ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور "اچھا سماج کیسے بنایا جائے" کے موضوع پر اپنے خیالات پیش کئے۔

۸ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۲ جولائی ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ تقریر کا عنوان تھا: کامیابی کا راز۔

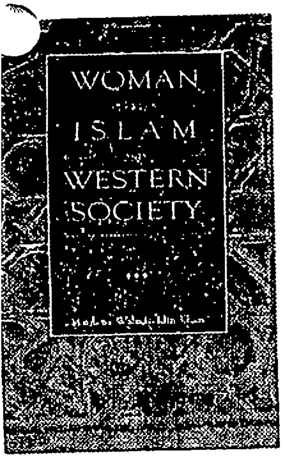
۹ الرسالہ کا ایک خصوصی نمبر زیر تیاری ہے۔ اس میں دکھایا جائے گا کہ الرسالہ کا مسلک عین وہی ہے جو تمام محقق علماء کا مسلک ہے۔ دونوں میں کوئی اختلاف نہیں۔

۱۰ فیسٹول آف اسپریچول یونٹی کے تحت لندن میں ستمبر ۱۹۹۴ کے پہلے ہفتہ میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے لندن کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں انگلینڈ کے دوسرے مقامات پر بھی مختلف پروگراموں میں شرکت کی۔ اس کی روداد سفرنامہ کے تحت ان شاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۱ جین اچاریہ شری تلسی کے آشرم (نئی دہلی) میں ۱۴ جولائی ۱۹۹۴ کو تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع تھا: منش منش کی طرح رہے، وہ راکشش نہ بن جائے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلام کی روشنی میں ایک تقریر کی۔

۱۲ دہلی کے انگریزی ہفت روزہ ریڈئنس کے اسٹاف رپورٹر مسٹر سید علی احمد نے ۱۵ جولائی ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ اسلام میں ٹالرنس کی کیا اہمیت ہے اور ٹالرنس کی حد کیا ہے۔

۱۳ سابق مرکزی وزیر بھاگے گوردھن (وفات ۳۱ جولائی ۱۹۹۳) کے مکان واقع گول مارکٹ، نئی دہلی میں ۱۶ جولائی ۱۹۹۴ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مختصر تقریر کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ موضوع بحث تھا: ملک کو ترقی یافتہ بنانے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے۔



MAN BETWEEN ISLAM
) WESTERN SOCIETY

aulana Wahiduddin Khan

ıtus of woman in Islam is the same as that ı. Injunctions about honour and respect ed for one sex are enjoined equally for the So far as rights in this world and ..n the Hereafter are concerned, there is ıfference between the sexes. In the ization of daily living, both are equal ıpants and partners. Yet Islam sees man as ınd woman as woman and, considering tural differences, it advocates the principle division of labour between the two sexes than the equality of labour.

4.5 cm, 256 pages
81-85063-75-3, Rs. 95

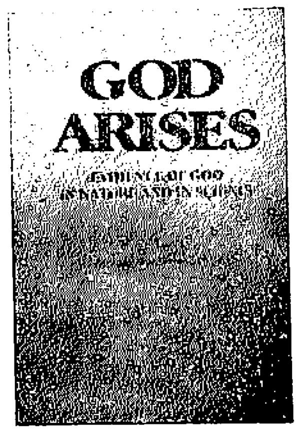
D ARISES

laulana Wahiduddin Khan

book, the result of 30 years spent by the ır in exhaustive research, attempts to nt the basic teachings of religion in the of modern knowledge and in a manner stent with modern scientific method. a thorough investigation of the subject, vriter has reached the conclusion that ous teachings are, academically, valid and standable and intellectually acceptable as any of the theories propounded by men of science.

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind." — *Al-Ahram* (Cairo)

22 x 14.5 cm, 271 pages
ISBN 81-85063, Rs. 85



ISLAM: CREATOR OF THE MODERN AGE*

By Maulana Wahiduddin Khan

Antiquity was an age of superstition: the present age is of science. Before reaching its present-day zenith, the modern, scientific age had to pass through three stages. The first was marked by the eradication of the superstitious mentality, the second saw the practical beginnings of scientific research; the third is the spectacular culmination of the scientific process in the second half of the twentieth century. The present volume examines the Islamic contribution to the completion of the first two stages during the millenium immediately following upon the emergence of Islam.

22 x 14.5 cm, 125 pages
ISBN 81-85063-78-8, Rs. 65

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	·
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

مطالعۂ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	·
کتاب زندگی	40/-
انوارِ حکمت	-
اقوالِ حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	20/-
عقلیاتِ اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	·
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	30/-
تعددِ ازواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
الاسلام یتحدی	85/-

ھندی

	·
سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	·
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتک واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	

God Arises	85/-
Muhammad	85/-
The Prophet of Revolution	
Islam As It Is	40/-
God-Oriented Life	60/-
Religion and Science	40/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thysellf	4/-
Muhammad	5/-
The Ideal Character	
Tabligh Movement	20/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of the Prophet	--
Islam the Voice of Human Nature	--
Islam the Creator of Modern Age	--

آڈیو کیسٹ

حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

حقیقتِ روزہ	150/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333   Fax : 91-11-4697333